QuranUrdu.com

تفہیم القرآن

صٓ

(۳۸)

QuranUrdu.com

صٓ

نام

آغاز ہی کے حرف صٓ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول

جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا، بعض رِوایات کی رُو سے یہ سورت اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکۂ معظّمہ میں عَلانِیَہ دعوت کا آغاز کیا تھا اور قریش کے سرداروں میں اس پر کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کا زمانۂ نُزول تقریباً نبوت کا چوتھا سال قرار پاتا ہے۔ بعض دوسری رِوایات اسے حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے بعد کا واقعہ بتاتی ہیں، اور معلوم ہے کہ وہ ہجرتِ حبشہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ ایک اور سلسلۂ رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالب کے آخری مرض کے زمانے میں وہ معاملہ پیش آیا تھا جس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ اسے اگر صحیح مانا جائے تو اس کا زمانۂ نُزول نبوت کا دسواں یا گیارھواں سال ہے۔

تاریخی پَس منظر

امام احمدؒ، نَسائیؒ، تِرْمِذیؒ، ابنِ جَرِیرؒ، ابنِ ابی شَیْبہؒ، ابنِ ابی حاتمؒ اور محمد بن اسحاقؒ وغیرہ نے جو رِوایات نقل کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابوطالب بیمار ہوئے اور قریش کے سرداروں نے محسوس کیا کہ اب یہ اِن کا آخری وقت ہے تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ چل کر شیخ سے بات کرنی چاہیے۔ وہ ہمارا اور اپنے بھتیجے کا جھگڑا چکا جائیں تو اچھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا انتقال ہو جائے اور ان کے بعد ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کریں اور عرب کے لوگ ہمیں طعنہ دیں کہ جب تک شیخ زندہ تھا، یہ لوگ اس کا لحاظ کرتے رہے، اب اس کے مرنے کے بعد ان لوگوں نے اس کے بھتیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا اور تقریباً ۲۵ سردارانِ قریش، جن میں ابوجَہل، ابوسُفیان، اُمَیّہ بن خَلَف، عاص بن وائل، اَسْوَد بن المُطَّلِب، عُقْبہ بن ابی مُعَیط، عُتْبہ اور شَیْبہ شامل تھے، ابوطالب کے پاس پہنچے۔ ان لوگوں نے پہلے تو حسبِ معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی شکایات بیان کیں، پھر کہا: ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرنے آئے ہیں۔ آپ کا بھتیجا ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم اسے اس کے دین پر چھوڑے دیتے ہیں۔ وہ جس معبُود کی عبادت کرنا چاہے کرے، ہمیں اس سے کوئی تعرّض نہیں۔ مگر وہ ہمارے معبُودوں کی مَذمّت نہ کرے اور یہ کوشش نہ کرتا پھرے کہ ہم اپنے معبُودوں کو چھوڑ دیں۔ اس شرط پر آپ ہم سے اس کی صلح کرا دیں۔ ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور آپؐ سے کہا کہ بھتیجے! یہ تمھاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ایک منصفانہ بات پر ان سے اتفاق کر لو تاکہ تمھارا اور ان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ پھر انھوں نے وہ بات حضورؐ کو بتائی جو سردارانِ قریش نے ان سے کہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: چچا جان! میں تو ان کے سامنے ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں جسے اگر یہ مان لیں تو عرب ان کا تابعِ فرمان اور عجم ان کا باج گزار

QuranUrdu.com

ہو جائے۔[1] یہ سن کر پہلے تو وہ لوگ سٹپٹا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کیا کہہ کر ایسے ایک مفید کلمے کو رد کر دیں۔ پھر کچھ سنبھل کر بولے: تم ایک کلمہ کہتے ہو، ہم ایسے دس کلمے کہنے کو تیار ہیں، مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ کلمہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللہُ۔ اس پر وہ سب یک بارگی اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ باتیں کہتے ہوئے نکل گئے جو اِس سورت کے ابتدائی حصّے میں اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہیں۔

ابنِ سعدؒ نے طَبَقات میں یہ سارا قصہ اُسی طرح بیان کیا ہے جس طرح اوپر مذکور ہوا، مگر اُن کی رِوایَت کے مطابق یہ ابو طالب کے مَرَضِ وفات کا نہیں بلکہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب حضورؐ نے دعوتِ عام کی ابتدا کی تھی اور مکے میں پَے در پَے یہ خبریں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں کہ آج فُلاں آدمی مسلمان ہوا اور کل فُلاں۔ اُس وقت سردارانِ قریش یکے بعد دیگرے کئی وفد ابو طالب کے پاس لے کر پہنچے تھے تاکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تبلیغ سے روک دیں، اور انھی وفود میں سے ایک وفد کے ساتھ یہ گفتگو ہوئی تھی۔

زَمَخشَری، رازِی، نَیسابُوری اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ وفد ابو طالب کے پاس اُس وقت گیا تھا جب حضرت عمرؓ کے ایمان لانے پر سردارانِ قریش بوکھلا گئے تھے۔ لیکن کتبِ روایت میں سے کسی میں اس کا حوالہ ہمیں نہیں مل سکا ہے اور نہ ان مفسرین نے اپنے ماخذ کا حوالہ دیا ہے۔ تاہم اگر یہ صحیح ہو تو یہ ہے سمجھ میں آنے والی بات۔ اس لیے کہ کفارِ قریش پہلے ہی یہ دیکھ کر گھبرائے ہوئے تھے کہ اسلام کی دعوت لے کر اُن کے درمیان سے ایک ایسا شخص اُٹھا ہے جو اپنی شرافت، بے داغ سیرت اور دانائی و سنجیدگی کے اعتبار سے ساری قوم میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اور پھر اس کا دستِ راست ابو بکرؓ جیسا آدمی ہے جسے مکہ اور اس کے اطراف کا بچہ بچہ ایک نہایت شریف، راست باز اور ذکی انسان کی حیثیت سے جانتا ہے۔ اب جو انھوں نے دیکھا ہو گا کہ عمرؓ بن خَطّاب جیسا جری اور صاحبِ عزم آدمی بھی ان دونوں سے جا ملا ہے تو یقیناً انھیں محسوس ہوا ہو گا کہ خطرہ حدِّ برداشت سے گزرتا جا رہا ہے۔

---

1. حضورؐ کے اس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ایک رِوایَت یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اریدھم علی کلمة واحدة یقولونھا تدین لھم بھا العرب وتؤدّی الیھم بھا العجم الجزیة۔ دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: ادعوھم الی ان یتکلموا بکلمة تدین لھم بھا العرب ویملکون بھا العجم۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے ابو طالب کے بجائے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا: کلمة واحدة تعطونیھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم۔ اور ایک رِوایَت کے الفاظ یہ ہیں: ارأیتم ان اعطیتکم کلمة تکلمتم بھا ملکتم بھا العرب ودانت لکم بھا العجم۔ ان لفظی اختلافات کے باوجود مُدّعا سب کا یکساں ہے، یعنی حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر میں ایک ایسا کلمہ تمھارے سامنے پیش کروں جسے قبول کر کے تم عرب و عجم کے مالک ہو جاؤ گے تو بتاؤ کہ یہ زیادہ بہتر بات ہے یا وہ جسے تم انصاف کی بات کہہ کر میرے سامنے پیش کر رہے ہو؟ تمھاری بھلائی اس کلمے کو مان لینے میں ہے یا اِس میں کہ جس حالت میں تم پڑے ہو اُسی میں تم کو پڑا رہنے دوں اور بس اپنی جگہ آپ ہی اپنے خدا کی عبادت کرتا رہوں؟

QuranUrdu.com

موضوع اور مَباحِث

اُوپر جس مجلس کا ذکر کیا گیا ہے، اُسی پر تبصرے سے اس سورت کا آغاز ہوا ہے۔ کفار اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کو بنیاد بنا کر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ان لوگوں کے انکار کی اصل وجہ دعوتِ اسلامی کا کوئی نَقص نہیں ہے بلکہ ان کا اپنا تکبُّر اور حسد اور تقلیدِ اَعمیٰ پر اصرار ہے۔ یہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنی ہی برادری کے ایک آدمی کو خدا کا نبی مان کر اُس کی پیروی قبول کر لیں۔ یہ اُنھی جاہلانہ تخیلات پر جمے رہنا چاہتے ہیں جن پر انھوں نے اپنے قریب کے زمانے کے لوگوں کو پایا ہے، اور جب اس جَہالت کے پردے کو چاک کر کے ایک شخص ان کے سامنے اصل حقیقت کو پیش کرتا ہے تو یہ اس پر کان کھڑے کرتے ہیں اور اسے عجیب بات بلکہ نرالی اور اَنہونی بات قرار دیتے ہیں۔ اِن کے نزدیک توحید اور آخرت کا تخیل محض نا قابلِ قبول ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا تخیُّل ہے جس کا بس مذاق ہی اُڑایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورہ کے ابتدائی حصّے میں بھی اور آخری فقروں میں بھی کفار کو صاف صاف مُتَنَبِّہ کیا ہے کہ جس شخص کا تم آج مذاق اُڑا رہے ہو اور جس کی رہنمائی قبول کرنے سے تم کو آج سخت انکار ہے، عنقریب وہی غالب آ کر رہے گا اور وہ وقت دُور نہیں ہے جب اِسی شہرِ مکہ میں، جہاں تم اس کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو، اس کے آگے تم سب سرنگوں نظر آؤ گے۔

پھر پَے درپَے ۹ پیغمبروں کا ذکر کر کے، جن میں حضرت داؤدؑ وسلیمانؑ کا قصہ زیادہ مفصَّل ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ بات سامعین کے ذہن نشین کرائی ہے کہ اُس کا قانونِ عدل بالکل بے لاگ ہے، اس کے ہاں انسان کا صحیح رَوِیَّہ ہی مقبول ہے، بے جابات خواہ کوئی بھی کرے وہ اس پر گرفت کرتا ہے، اور اس کے ہاں وہی لوگ پسند کیے جاتے ہیں جو لغزش پر اصرار نہ کریں بلکہ اس پر مُتَنَبِّہ ہوتے ہی تائب ہو جائیں اور دنیا میں آخرت کی جواب دِہی کو یاد رکھتے ہوئے زندگی بسر کریں۔

اس کے بعد فرماں بردار بندوں اور سرکش بندوں کے اُس انجام کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو وہ عالَمِ آخرت میں دیکھنے والے ہیں، اور اس سلسلے میں کفار کو دو باتیں خاص طور پر بتائی گئی ہیں: ایک، یہ کہ آج جن سرداروں اور پیشواؤں کے پیچھے جاہل لوگ اندھے بن کر ضلالت کی راہ پر چلے جا رہے ہیں، کل وہی جہنّم میں اپنے پیروؤں سے پہلے پہنچے ہوئے ہوں گے اور دونوں ایک دوسرے کو کوس رہے ہوں گے۔ دوسرے، یہ کہ آج جن اہلِ ایمان کو یہ لوگ ذلیل وخوار سمجھ رہے ہیں، کل یہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ اُن کا جہنّم میں کہیں نام و نشان تک نہیں ہے اور یہ خود اُس کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

آخر میں قصۂ آدم اور ابلیس کا ذکر فرمایا گیا ہے اور اس سے مقصود کفارِ قریش کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے جھکنے سے جو تکبر تمھیں مانع ہو رہا ہے، وہی تکبُّر آدمؑ کے آگے جھکنے سے ابلیس کو بھی مانع ہوا تھا۔ خدا نے جو مرتبہ آدمؑ کو دیا تھا اُس پر ابلیس نے حسد کیا اور حکمِ خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کر کے لعنت کا مستحق ہوا۔ اسی طرح جو مرتبہ خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا ہے اس پر تم حسد کر رہے ہو اور اس بات کے لیے تیار نہیں ہو کہ جسے خدا نے رسول مقرر کیا ہے اس کی اطاعت کرو، اس لیے جو انجام ابلیس کا ہونا ہے وہی آخرِ کار تمھارا بھی ہونا ہے۔

آیاتها ۸۸ سُوْرَةُ صٓ مَكِّيَّةٌ رکوعاتها ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِؕ ۝۱ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ
وَّ شِقَاقٍ ۝۲ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّ لَاتَ حِیْنَ
مَنَاصٍ ۝۳ وَ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ٘ وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ

صٓ[1]، قسم ہے نصیحت بھرے[2] قرآن کی، بلکہ یہی لوگ، جنھوں نے ماننے سے انکار کیا ہے، سخت تکبّر اور ضد میں مبتلا ہیں[3]۔ اِن سے پہلے ہم ایسی کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں (اور جب اُن کی شامت آئی ہے) تو وہ چیخ اُٹھے ہیں، مگر وہ وقت بچنے کا نہیں ہوتا۔

اِن لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجّب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود اِنھی میں سے آ گیا[4]۔ منکرین کہنے لگے کہ

---

۱ – اگرچہ تمام حُروفِ مُقطّعات کی طرح ص کے مفہوم کا تعیُّن بھی مشکل ہے، لیکن ابنِ عباسؓ اور ضحّاکؒ کا یہ قول بھی کچھ دل کو لگتا ہے کہ اس سے مراد ہے: صادقٌ فی قولِہٖ، یا صَدَقَ محمّدٌ۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادق ہیں، جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ صاد کے حرف کو ہم اردو میں بھی اسی سے ملتے جلتے معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: میں اس پر صاد کرتا ہوں، یعنی اس کی تصدیق کرتا ہوں، یا اسے صحیح قرار دیتا ہوں۔

۲ – اصل الفاظ ہیں: ذِی الذِّكْرِ۔ اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک، ذی شرف، یعنی قرآنِ بزرگ۔ دوسرے، ذی التذکیر، یعنی نصیحت سے لبریز قرآن، یا بھولا ہوا سبق یاد دلانے والا اور غفلت سے چونکانے والا قرآن۔

۳ – اگر ص کی وہ تاویل قبول کی جائے جو ابنِ عباسؓ اور ضحّاکؒ نے بیان کی ہے تو اس جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ "قسم ہے اس قرآنِ بزرگ، یا اس نصیحت سے لبریز قرآن کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچّی بات پیش کر رہے ہیں، مگر جو لوگ انکار پر جمے ہوئے ہیں وہ دراصل ضد اور تکبر میں مبتلا ہیں۔" اور اگر ص کو اُن حُروفِ مُقطّعات میں سے سمجھا جائے جن کا مفہوم متعین نہیں کیا جاسکتا، تو پھر قسم کا جواب محذوف ہے جس پر "بلکہ" اور اس کے بعد کا فقرہ خود روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی پوری عبارت پھر یوں ہوگی کہ "اِن منکرین کے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ جو دین ان کے سامنے پیش کیا جارہا ہے اُس میں کوئی خلل ہے، یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اظہارِ حق میں کوئی کوتاہی کی ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف ان کی جھوٹی شیخی، ان کی جاہلانہ نخوت اور ان کی ہَٹ دھرمی ہے، اور اس پر یہ نصیحت بھرا قرآن شاہد ہے جسے دیکھ کر ہر غیر متعصّب آدمی تسلیم کرے گا کہ اس میں فہمایش کا حق پوری طرح ادا کر دیا گیا ہے۔"

QuranUrdu.com

هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝٤ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا
لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝٥ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى
اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝٦ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ
اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝٧ ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا ؕ

"یہ ساحر[۵] ہے، سخت جھوٹا ہے، کیا اِس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" اور سردارانِ قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے[۶] کہ "چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبُودوں کی عبادت پر۔ یہ بات[۷] تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے[۸]۔ یہ بات ہم نے زمانۂ قریب کی ملّت میں کسی سے نہیں سُنی[۹]۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔ کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا؟"

۴ – یعنی یہ ایسے احمق لوگ ہیں کہ جب ایک دیکھا بھالا آدمی خود اِن کی اپنی جنس، اپنی قوم اور اپنی ہی برادری میں سے ان کو خبردار کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تو ان کو یہ عجیب بات معلوم ہوئی۔ حالانکہ عجیب بات اگر ہوتی تو یہ ہوتی کہ انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے آسمان سے کوئی اور مخلوق بھیج دی جاتی، یا ان کے درمیان یکایک ایک اجنبی آدمی کہیں باہر سے آ کھڑا ہوتا اور نبوت کرنی شروع کر دیتا۔ اُس صورت میں تو بلاشبہ یہ لوگ بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ یہ عجیب حرکت ہمارے ساتھ کی گئی ہے، بھلا جو انسان ہی نہیں ہے وہ ہمارے حالات اور جذبات اور ضروریات کو کیا جانے گا کہ ہماری رہنمائی کر سکے، یا جو اجنبی آدمی اچانک ہمارے درمیان آ گیا ہے اس کی صداقت کو آخر ہم کیسے جانچیں اور کیسے معلوم کریں کہ یہ بھروسے کے قابل آدمی ہے یا نہیں، اس کی سیرت و کردار کو ہم نے کب دیکھا ہے کہ اس کی بات کا اعتبار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکیں۔

۵ – حضورؐ کے لیے ساحر کا لفظ وہ لوگ اس معنیٰ میں بولتے تھے کہ یہ شخص کچھ ایسا جادو کرتا ہے جس سے آدمی دیوانہ ہو کر اِس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ کسی تعلق کے کٹ جانے اور کوئی نقصان پہنچ جانے کی پروا نہیں کرتا۔ باپ کو بیٹا اور بیٹے کو باپ چھوڑ بیٹھتا ہے۔ بیوی شوہر کو چھوڑ دیتی ہے اور شوہر بیوی سے جدا ہو جاتا ہے۔ ہجرت کی نوبت آئے تو دامن جھاڑ کر وطن سے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ کاروبار بیٹھ جائے اور ساری برادری بائیکاٹ کر دے تو اسے بھی گوارا کر لیتا ہے۔ سخت سے سخت جسمانی اذیتیں بھی انگیز کر جاتا ہے، مگر اس شخص کا کلمہ پڑھنے سے کسی طرح باز نہیں آتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۵)

۶ – اشارہ ہے اُن سرداروں کی طرف جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سُن کر ابو طالب کی مجلس سے اٹھ گئے تھے۔

۷ – یعنی حضورؐ کا یہ کہنا کہ کلمۂ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کے قائل ہو جاؤ تو عرب و عجم سب تمھارے تابعِ فرمان ہو جائیں گے۔

QuranUrdu.com

بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِیْ ۚ بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ ۸ؕ اَمْ
عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِیْزِ الْوَهَّابِ ۹ۚ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ۫ فَلْیَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ ۱۰

اصل بات یہ ہے کہ یہ میرے ''ذِکر'' پر شک کر رہے ہیں،^8^ اور یہ ساری باتیں اس لیے کر رہے ہیں کہ انھوں نے میرے عذاب کا مزا چکّھا نہیں ہے۔ کیا تیرے داتا اور غالب پروردگار کی رحمت کے خزانے اِن کے قبضے میں ہیں؟ کیا یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک ہیں؟ اچھا تو یہ عالَمِ اسباب کی بلندیوں پر چڑھ کر دیکھیں[11]!

۸ – اُن کا مطلب یہ تھا کہ اس دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے، دراصل یہ دعوت اس غرض سے دی جارہی ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابعِ فرمان ہو جائیں اور یہ ہم پر اپنا حکم چلائیں۔

۹ – یعنی قریب کے زمانے میں ہمارے اپنے بزرگ بھی گزرے ہیں، عیسائی اور یہودی بھی ہمارے ملک اور آس پاس کے ملکوں میں موجود ہیں، اور مجوسیوں سے ایران و عراق اور مشرقی عرب بھرا پڑا ہے۔ کسی نے بھی ہم سے یہ نہیں کہا کہ انسان بس ایک اللہ رب العالمین کو مانے اور دوسرے کسی کو نہ مانے۔ آخر ایک اکیلے خدا پر کون اکتفا کرتا ہے۔ اللہ کے پیاروں کو تو سب ہی مان رہے ہیں۔ اُن کے آستانوں پر جا کر ماتھے رگڑ رہے ہیں۔ نذریں اور نیازیں دے رہے ہیں۔ دعائیں مانگ رہے ہیں۔ کہیں سے اولاد ملتی ہے۔ کہیں سے رزق ملتا ہے۔ کسی آستانے پر جو مراد مانگو بَر آتی ہے۔ اُن کے تصرُّفات کو ایک دنیا مان رہی ہے اور اُن سے فیض پانے والے بتا رہے ہیں کہ اِن درباروں سے لوگوں کی کس کس طرح مشکل کُشائی و حاجت روائی ہوتی ہے۔ اب اِس شخص سے ہم یہ نرالی بات سُن رہے ہیں، جو کبھی کسی سے نہ سنی تھی، کہ ان میں سے کسی کا بھی خدائی میں کوئی حصہ نہیں اور پوری کی پوری خدائی بس ایک اکیلے اللہ ہی کی ہے۔

۱۰ – بالفاظِ دیگر، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَے محمد (صلی اللہ علیک وسلم)! یہ لوگ دراصل تمھیں نہیں جھٹلا رہے ہیں بلکہ مجھے جھٹلا رہے ہیں۔ تمھاری صداقت پر تو پہلے بھی انھوں نے شک نہیں کیا تھا۔ آج یہ شک جو کیا جارہا ہے یہ دراصل میرے ''ذکر'' کی وجہ سے ہے۔ مَیں نے ان کو نصیحت کرنے کی خدمت جب تمھارے سُپرد کی تو یہ اُسی شخص کی صداقت میں شک کرنے لگے جس کی راست بازی کی پہلے قسمیں کھایا کرتے تھے۔ یہی مضمون سورۂ اَنعام آیت ۳۳ میں بھی گزر چکا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حاشیہ ۲۱)

۱۱ – یہ کفار کے اِس قول کا جواب ہے کہ ''کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا''۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ نبی ہم کس کو بنائیں اور کسے نہ بنائیں، اس کا فیصلہ کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔ یہ لوگ آخر کب سے اِس فیصلے کے مختار ہو گئے۔ اگر یہ اس کے مختار بننا چاہتے ہیں تو کائنات کی فرماں روائی کے منصب پر قبضہ کرنے کے لیے عرش پر پہنچنے کی کوشش کریں تا کہ جسے یہ اپنی رحمت کا مستحق سمجھیں اُس پر وحی نازل ہو اور جسے ہم مستحق سمجھتے ہیں اس پر وہ نازل نہ ہو۔ یہ مضمون

QuranUrdu.com

جُنۡدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهۡزُوۡمٌ مِّنَ الۡاَحۡزَابِ ﴿۱۱﴾ كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ
نُوۡحٍ وَّعَادٌ وَّفِرۡعَوۡنُ ذُو الۡاَوۡتَادِ ﴿۱۲﴾ وَثَمُوۡدُ وَقَوۡمُ لُوۡطٍ وَّاَصۡحٰبُ
لۡـَٔيۡكَةِ ؕ اُولٰٓئِكَ الۡاَحۡزَابُ ﴿۱۳﴾ اِنۡ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ
عِقَابِ ﴿۱۴﴾ ع وَمَا يَنۡظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنۡ
فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾ وَقَالُوۡا رَبَّنَا عَجِّلۡ لَّنَا قِطَّنَا قَبۡلَ يَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿۱۶﴾

ع ۱۴/۱۰

یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھّا ہے جو اِسی جگہ شکست کھانے والا ہے۔[۱۲] اِن سے پہلے نوحؑ کی قوم، اور عاد، اور میخوں والا فرعون،[۱۳] اور ثمود، اور قومِ لوطؑ، اور اَیکہ والے جھُٹلا چکے ہیں۔ جتھّے وہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھُٹلایا اور میری عُقُوبَت کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو کر رہا۔ ع یہ لوگ بھی بس ایک دھماکے کے منتظر ہیں جس کے بعد کوئی دوسرا دھماکا نہ ہوگا۔[۱۴] اور یہ کہتے ہیں کہ اَے ہمارے رب! یوم الحساب سے پہلے ہی ہمارا حصّہ ہمیں جلدی سے دے دے۔[۱۵]

متعدّد مقامات پر قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے، کیونکہ کفارِ قریش بار بار کہتے تھے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیسے نبی بن گئے، کیا خدا کو قریش کے بڑے بڑے سرداروں میں سے کوئی اس کام کے لیے نہ ملا تھا۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۱۰۰۔ الزُّخرُف، آیات ۳۱-۳۲)

۱۲ – ’’اِسی جگہ‘‘ کا اشارہ مکۂ معظّمہ کی طرف ہے۔ یعنی جہاں یہ لوگ یہ باتیں بنا رہے ہیں، اِسی جگہ ایک دن یہ شکست کھانے والے ہیں اور یہیں وہ وقت آنے والا ہے جب یہ منہ لٹکائے اُسی شخص کے سامنے کھڑے ہوں گے جسے آج یہ حقیر سمجھ کر نبی تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

۱۳ – فرعون کے لیے ”ذِی الۡاَوۡتَادِ“ (میخوں والا) یا تو اس معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے کہ اس کی سلطنت ایسی مضبوط تھی گویا میخ زمین پر ٹُھکی ہوئی ہو۔ یا اس بنا پر کہ اس کے کثیر التعداد لشکر جہاں ٹھیرتے تھے وہاں ہر طرف خیموں کی میخیں ہی میخیں ٹُھکی نظر آتی تھیں۔ یا اس بنا پر کہ وہ جس سے ناراض ہوتا تھا اسے میخیں ٹھونک کر عذاب دیا کرتا تھا۔ اور ممکن ہے کہ میخوں سے مراد اَہرامِ مصر ہوں جو زمین کے اندر میخ کی طرح ٹُھکے ہوئے ہیں۔

۱۴ – یعنی عذاب کا ایک ہی کڑکا انھیں ختم کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔ کسی دوسرے کڑکے کی حاجت پیش نہ آئے گی۔ دوسرا مفہوم اس فقرے کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد پھر انھیں کوئی افاقہ نصیب نہ ہوگا، اتنی دیر کی بھی مُہلت نہ ملے گی جتنی دیر اُونٹنی کا دودھ نچوڑتے وقت ایک دفعہ سونتنے ہوئے تھَن میں دوبارہ سونتنے تک دُودھ اُترنے میں لگتی ہے۔

QuranUrdu.com

اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ اذۡكُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَیۡدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾
اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِشۡرَاقِ ﴿ۙ۱۸﴾ وَ الطَّیۡرَ

اَے نبیؐ! صبر کرو اُن باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں،[16] اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤدؑ کا قصہ بیان کرو[17] جو بڑی قوتوں کا مالک تھا۔[18] ہر معاملے میں اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا تھا۔ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مُسَخَّر کر رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ پرندے

۱۵ – یعنی اللہ کے عذاب کا حال تو ہے وہ جو ابھی بیان کیا گیا، اور اِن نادانوں کا حال یہ ہے کہ یہ نبی سے مذاق کے طور پر کہتے ہیں کہ جس یوم الحساب سے تم ہمیں ڈراتے ہو اُس کے آنے تک ہمارے معاملے کو نہ ٹالو بلکہ ہمارا حساب ابھی چُکوا دو، جو کچھ بھی ہمارے حصے کی شامت لکھی ہے وہ فوراً ہی آجائے۔

۱۶ – اشارہ ہے کفارِ مکہ کی اُن باتوں کی طرف جن کا ذکر اُوپر گزر چکا ہے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کی یہ بکواس کہ یہ شخص ساحر اور کذّاب ہے، اور ان کا یہ اعتراض کہ اللہ میاں کے پاس رسول بنانے کے لیے کیا بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا، اور یہ الزام کہ اس دعوتِ توحید سے اس شخص کا مقصد کوئی مذہبی تبلیغ نہیں ہے بلکہ اس کی نیت کچھ اور ہی ہے۔

۱۷ – اس فقرے کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو۔“ پہلے ترجمے کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اس قصے میں اِن لوگوں کے لیے ایک سبق ہے۔ اور دوسرے ترجمے کے لحاظ سے مراد یہ ہے کہ اس قصے کی یاد خود تمھیں صبر کرنے میں مدد دے گی۔ چونکہ یہ قصہ بیان کرنے سے دونوں ہی باتیں مقصود ہیں، اس لیے الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جو دونوں مفہوموں پر دلالت کرتے ہیں۔ (حضرت داؤدؑ کے قصے کی تفصیلات اس سے پہلے حسبِ ذیل مقامات پر گزر چکی ہیں: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۷۳۔ جلد دوم، بنی اسرائیل، حواشی ۷-۶۳۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷۰ تا ۷۳، النمل، حواشی ۱۸ تا ۲۰۔ جلد چہارم، سبا، حواشی ۱۴ تا ۱۶)

۱۸ – اصل الفاظ ہیں: ذَا الۡاَیۡدِ، ”ہاتھوں والا“۔ ہاتھ کا لفظ صرف عَرَبی زبان ہی میں نہیں، دوسری زبانوں میں بھی قوت و قدرت کے لیے اِستِعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کے لیے جب ان کی صفت کے طور پر یہ فرمایا گیا کہ وہ ”ہاتھوں والے“ تھے تو اس کا مطلب لازماً یہی ہوگا کہ وہ بڑی قوتوں کے مالک تھے۔ اِن قوتوں سے بہت سی قوتیں مراد ہو سکتی ہیں۔ مثلاً جسمانی طاقت، جس کا مظاہرہ انھوں نے جالُوت سے جنگ کے موقع پر کیا تھا۔ فوجی اور سیاسی طاقت، جس سے انھوں نے گردوپیش کی مشرک قوموں کو شکست دے کر ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم کر دی تھی۔ اَخلاقی طاقت، جس کی بدولت انھوں نے بادشاہی میں فقیری کی اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے اور اس کے حُدود کی پابندی کرتے رہے۔ اور عبادت کی طاقت، جس کا حال یہ تھا کہ حکومت و فرماں روائی اور جہاد فی سبیل اللہ کی مصروفیتوں کے باوجود، صحیحین کی رِوایت کے مطابق، وہ ہمیشہ ایک دن بیچ روزہ رکھتے تھے اور روزانہ ایک تہائی رات نماز میں گزارتے تھے۔ امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت ابوالدرداءؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت داؤدؑ کا ذکر آتا

QuranUrdu.com

مَحۡشُوۡرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَشَدَدۡنَا مُلۡكَهٗ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡحِكۡمَةَ وَفَصۡلَ
الۡخِطَابِ ﴿۲۰﴾ وَهَلۡ اَتٰٮكَ نَبَؤُا الۡخَصۡمِ ۘ اِذۡ تَسَوَّرُوا الۡمِحۡرَابَ ۙ﴿۲۱﴾ اِذۡ
دَخَلُوۡا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنۡهُمۡ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ ۚ خَصۡمٰنِ بَغٰى بَعۡضُنَا عَلٰى
بَعۡضٍ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَنَا بِالۡحَقِّ وَلَا تُشۡطِطۡ وَاهۡدِنَاۤ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾
اِنَّ هٰذَاۤ اَخِىۡ قف لَهٗ تِسۡعٌ وَّتِسۡعُوۡنَ نَعۡجَةً وَّلِىَ نَعۡجَةٌ وَّاحِدَةٌ قف

وقف لازم

سمٹ آتے اور سب کے سب اُس کی تسبیح کی طرف متوجّہ ہو جاتے تھے۔[۱۹] ہم نے اس کی سلطنت مضبُوط کر دی تھی، اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کُن بات کہنے کی صلاحیّت بخشی تھی۔[۲۰] پھر تمھیں کچھ خبر پہنچی ہے اُن مقدّمے والوں کی جو دیوار چڑھ کر اُس کے بالا خانے میں گُھس آئے تھے؟[۲۱] جب وہ داؤدؑ کے پاس پہنچے تو وہ انھیں دیکھ کر گھبرا گیا۔[۲۲] انھوں نے کہا: "ڈریے نہیں، ہم دو فریقِ مقدّمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجیے، بے انصافی نہ کیجیے اور ہمیں راہِ راست بتائیے۔ یہ میرا بھائی ہے،[۲۳] اِس کے پاس ننّانوے دُنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دُنبی ہے۔

تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: کَانَ اَعۡبَدَ الۡبَشَرِ، "وہ سب سے زیادہ عبادت گزار آدمی تھے۔"

۱۹ — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۱۔

۲۰ — یعنی ان کا کلام الجھا ہوا نہ ہوتا تھا کہ ساری تقریر سُن کر بھی آدمی نہ سمجھ سکے کہ کہنا کیا چاہتے ہیں، بلکہ وہ جس معاملے پر بھی گفتگو کرتے، اس کے تمام بنیادی نکات کو مُنقّح کر کے رکھ دیتے، اور اصل فیصلہ طلب مسئلے کو ٹھیک ٹھیک متعیّن کر کے اس کا بالکل دو ٹوک جواب دے دیتے تھے۔ یہ بات کسی شخص کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک وہ عقل و فہم اور قادر الکلامی کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچا ہوا نہ ہو۔

۲۱ — حضرت داؤدؑ کا ذکر جس غرض کے لیے اس مقام پر کیا گیا ہے اس سے مقصود دراصل یہی قصّہ سنانا ہے جو یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اُن کی جو صفاتِ عالیہ بطورِ تمہید بیان کی گئی ہیں ان کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ داؤد علیہ السلام، جن کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے، کس مرتبے کے انسان تھے۔

۲۲ — گھبرانے کی وجہ یہ تھی کہ دو آدمی فرماں روائے وقت کے پاس اُس کی خلوَت گاہ میں سیدھے راستے سے جانے کے بجائے یکایک دیوار چڑھ کر جا پہنچے تھے۔

QuranUrdu.com

فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَ عَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ
بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ
لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ
وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ ﴿۲۴﴾ السجدۃ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا

اِس نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک دُنبی بھی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا لیا۔[۲۴]" داؤدؑ نے جواب دیا: "اِس شخص نے اپنی دُنبیوں کے ساتھ تیری دُنبی ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تجھ پر ظلم کیا،[۲۵] اور واقعہ یہ ہے کہ مِل جُل کر ساتھ رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں، بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے اور عملِ صالح کرتے ہیں، اور ایسے لوگ کم ہی ہیں۔" (یہ بات کہتے کہتے) داؤدؑ سمجھ گیا کہ یہ تو ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے، چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رُجوع کر لیا۔[۲۶] تب ہم نے اس کا وہ قصور معاف کیا اور یقیناً ہمارے ہاں اس کے لیے

۲۳ – بھائی سے مراد حقیقی بھائی نہیں بلکہ دینی اور قومی بھائی ہے۔

۲۴ – آگے کی بات سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی ضروری ہے کہ اِستغاثہ کا یہ فریق یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ اس شخص نے میری وہ ایک دُنبی چھین لی اور اپنی دُنبیوں میں ملا لی، بلکہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ مجھ سے میری دُنبی مانگ رہا ہے، اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا لیا ہے، کیونکہ یہ بڑی شخصیت کا آدمی ہے اور میں ایک غریب آدمی ہوں، میں اپنے اندر اتنی سکت نہیں پاتا کہ اس کا مطالبہ ردّ کر دوں۔

۲۵ – یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ حضرت داؤدؑ نے ایک ہی فریق کی بات سُن کر اپنا فیصلہ کیسے دے دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب مدّعی کی شکایت پر مدّعا علیہ خاموش رہا اور اس کی تردید میں کچھ نہ بولا تو یہ خود ہی اس کے اقرار کا ہم معنیٰ تھا۔ اس بنا پر حضرت داؤدؑ نے یہ رائے قائم کی کہ واقعہ وہی کچھ ہے جو مدّعی بیان کر رہا ہے۔

۲۶ – اس امر میں اختلاف ہے کہ اس مقام پر سجدۂ تلاوت واجب ہے یا نہیں۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ یہاں سجدہ واجب نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک نبی کی توبہ ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ وجوب کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں ابنِ عباسؓ سے تین روایتیں محدثین نے نقل کی ہیں۔ عِکرِمہ کی رِوایت یہ ہے کہ ابنِ عباسؓ نے فرمایا: "یہ اُن آیات میں سے نہیں ہے جن پر سجدہ لازم ہے

QuranUrdu.com

لَزُلۡفٰی وَ حُسۡنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾ یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰکَ خَلِیۡفَۃً فِی الۡاَرۡضِ

تقرّب کا مقام اور بہتر انجام ہے۔[۲۷] (ہم نے اس سے کہا:) ”اے داؤدؑ! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے،

مگر میں نے اس مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرتے دیکھا ہے۔“ (بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، مُسندِ احمد) دوسری رِوایت جواُن سے سعید بن جُبَیرؒ نے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ”سورۂ صٓ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور فرمایا: داؤد علیہ السلام نے توبہ کے طور پر سجدہ کیا تھا اور ہم شکر کے طور پر سجدہ کرتے ہیں“، یعنی اس بات پر کہ ان کی توبہ قبول ہوئی۔ (نَسائی) تیسری رِوایت جو مجاہدؒ نے ان سے نقل کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ ہَدَی اللّٰہُ فَبِہُدٰىہُمُ اقۡتَدِہۡ ”یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے راہِ راست دکھائی تھی، لہٰذا تم ان کے طریقے کی پیروی کرو۔“ اب چونکہ حضرت داؤدؑ بھی ایک نبی تھے اور انھوں نے اس موقع پر سجدہ کیا تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے اقتدا میں یہاں سجدہ فرمایا۔ (بخاری) یہ تین بیانات تو حضرت ابنِ عباسؓ کے ہیں۔ اور حضرت ابوسعید خُدریؓ کا بیان یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبے میں سورۂ صٓ پڑھی اور جب آپؐ اس آیت پر پہنچے تو آپؐ نے منبر پر سے اُتر کر سجدہ کیا اور آپؐ کے ساتھ سب حاضرین نے بھی کیا۔ پھر ایک دوسرے موقع پر اسی طرح آپؐ نے یہی سورہ پڑھی تو اس آیت کو سنتے ہی لوگ سجدہ کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ حضورؐ نے فرمایا: ”یہ ایک نبی کی توبہ ہے، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ سجدے کے لیے تیار ہوگئے ہو“ ـــــ یہ فرما کر آپؐ منبر سے اُترے اور سجدہ کیا اور سب حاضرین نے بھی کیا۔ (ابوداؤد) ان رِوایات سے اگرچہ وجوبِ سجدہ کی قطعی دلیل تو نہیں ملتی، لیکن کم ازکم اتنی بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر اکثر سجدہ فرمایا ہے، اور سجدہ نہ کرنے کی بہ نسبت یہاں سجدہ کرنا بہرحال افضل ہے۔ بلکہ ابنِ عباسؓ کی تیسری رِوایت، جو ہم نے اوپر بخاری کے حوالے سے نقل کی ہے، عَدَمِ وجوب کی بہ نسبت وجوب کے حکم کا پلڑا جھکا دیتی ہے۔

ایک اور مضمون جو اس آیت سے نکلتا ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں خَرَّ رَاکِعًا (رُکوع میں گر پڑا) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، مگر تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد خَرَّ سَاجِدًا (سجدے میں گر پڑا) ہے۔ اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب نے یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ نماز یا غیر نماز میں آیتِ سجدہ سُن کر یا پڑھ کر آدمی سجدے کے بجائے صرف رُکوع بھی کرسکتا ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے رُکوع کا لفظ استعمال کر کے سجدہ مراد لیا ہے تو معلوم ہوا کہ رکوع سجدے کا قائم مقام ہوسکتا ہے۔ فُقَہائے شافعیہ میں سے امام خَطّابی کی بھی یہی رائے ہے۔ یہ رائے اگرچہ بجائے خود صحیح اور معقول ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے عمل میں ہم کو ایسی کوئی نظیر نہیں ملی کہ آیتِ سجدہ پر سجدہ کرنے کے بجائے رُکوع ہی کر لینے پر اِکتفا کیا گیا ہو۔ لہٰذا اس رائے پر عمل صرف اُس صورت میں کرنا چاہیے جب سجدہ کرنے میں کوئی اَمرِ مانع ہو۔ اسے معمول بنالینا دُرست نہیں ہے، اور خود امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا منشا بھی یہ نہیں ہے کہ اسے معمول بنایا جائے، بلکہ وہ صرف اس کے جواز کے قائل ہیں۔

۲۷ - اس سے معلوم ہوا کہ حضرت داؤدؑ سے قصور تو ضرور ہوا تھا، اور وہ کوئی ایسا قصور تھا جو دُنبیوں والے مُقدّمے سے کسی طرح کی مماثلت رکھتا تھا اِسی لیے اُس کا فیصلہ سناتے ہوئے معاً ان کو یہ خیال آیا کہ یہ میری آزمائش ہوئی ہے، لیکن اُس

QuranUrdu.com

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۞۲۶ ع

ع ۲ ۱۲ ۱۱

لہٰذا تُو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حُکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً اُن کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بُھول گئے ۲۸ ۔" ع

قصور کی نوعیت ایسی شدید نہ تھی کہ اسے معاف نہ کیا جاتا، یا اگر معاف کیا بھی جاتا تو وہ اپنے مرتبۂ بلند سے گرا دیے جاتے۔ اللہ تعالیٰ یہاں خود تصریح فرما رہا ہے کہ جب انھوں نے سجدے میں گر کر توبہ کی تو نہ صرف یہ کہ انھیں معاف کر دیا گیا، بلکہ دنیا اور آخرت میں ان کو جو بلند مقام حاصل تھا اُس میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔

۲۸ – یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندیِ دَرجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤدؑ کو فرمائی۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو فعل اُن سے صادر ہوا تھا اُس کے اندر خواہشِ نفس کا کچھ دخل تھا، اس کا حاکمانہ اِقتِدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا، اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حُکومت کرنے والے کسی فرماں روا کو زیب نہ دیتا تھا۔

یہاں پہنچ کر تین سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں: اول، یہ کہ وہ فعل کیا تھا؟ دوسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صاف صاف بیان کرنے کے بجائے اِس طرح پردے پردے ہی میں اس کی طرف کیوں اشارہ کیا؟ تیسرے، یہ کہ اِس سِیاق وسَباق میں اس کا ذکر کس مُناسبت سے کیا گیا ہے؟

جن لوگوں نے بائبل (عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابِ مقدّس) کا مُطالَعہ کیا ہے ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں حضرت داؤدؑ پر اُورِیّاہ حِتّی (Uriah the Hittite) کی بیوی سے زنا کرنے، اور پھر اُورِیّاہ کو ایک جنگ میں قصداً ہلاک کروا کر اُس کی بیوی سے نکاح کر لینے کا صاف صاف الزام لگایا گیا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہی عورت، جس نے ایک شخص کی بیوی ہوتے ہوئے اپنے آپ کو حضرت داؤدؑ کے حوالے کیا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کی ماں تھی۔ یہ پورا قصہ بائبل کی کتابِ سموئیل دوم، باب ۱۱ – ۱۲ میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے یہ بائبل میں درج ہو چکا تھا۔ دُنیا بھر کے یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جو بھی اپنی اِس کتابِ مقدس کی تلاوت کرتا، یا اسے سُنتا تھا، وہ اس قصے سے نہ صرف واقف تھا بلکہ اس پر ایمان بھی لاتا تھا۔ انھی لوگوں کے ذریعے سے یہ دنیا میں مشہور ہوا، اور آج تک حال یہ ہے کہ مغربی مَمالک میں بنی اسرائیل اور عبرانی مذہب کی تاریخ پر کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی جاتی جس میں حضرت داؤدؑ کے خلاف اِس الزام کو دُہرایا نہ جاتا ہو۔ اس مشہور قصے میں یہ بات بھی درج ہے کہ:

"خداوند نے نَاتَن کو داؤدؑ کے پاس بھیجا۔ اُس نے اس کے پاس آ کر اس سے کہا: کسی شہر میں دو شخص تھے۔

QuranUrdu.com

ایک امیر، دوسرا غریب۔ اُس امیر کے پاس بہت سے ریوڑ اور گلّے تھے۔ پر اُس غریب کے پاس بھیڑ کی ایک پٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا جسے اس نے خرید کر پالا تھا، اور وہ اُس کے اور اُس کے بال بچوں کے ساتھ بڑھی تھی۔ وہ اُسی کے نوالے میں سے کھاتی اور اس کے پیالے سے پیتی اور اس کی گود میں سوتی تھی اور اس کے لیے بطور بیٹی کے تھی۔ اور اُس امیر کے ہاں کوئی مسافر آیا۔ سو اُس نے اُس مسافر کے لیے جو اُس کے ہاں آیا تھا، پکانے کو اپنے ریوڑ اور گلّے میں سے کچھ نہ لیا بلکہ اُس غریب کی بھیڑ لے لی اور اُس شخص کے لیے، جو اُس کے ہاں آیا تھا، پکائی۔ تب داؤد کا غضب اُس شخص پر بشدت بھڑکا اور اُس نے ناتن سے کہا کہ خداوند کی حیات کی قسم! کہ وہ شخص جس نے یہ کام کیا، واجب القتل ہے۔ سو اُس شخص کو اس بھیڑ کا چوگنا بھرنا پڑے گا، کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور اسے ترس نہ آیا۔ تب ناتن نے داؤد سے کہا کہ وہ شخص تُو ہی ہے...... تو نے حِتّی اُوریاہ کو تلوار سے مارا اور اس کی بیوی لے لی تاکہ وہ تیری بیوی بنے اور اس کو بنی عمّون کی تلوار سے قتل کروایا۔" (۲-سموئیل، باب ۱۲، فقرات ۱ تا ۹)

اس قصے اور اُس کی اِس شہرت کی موجودگی میں یہ ضرورت باقی نہ تھی کہ قرآنِ مجید میں اس کے متعلق کوئی تفصیلی بیان دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ ہے بھی نہیں کہ وہ اپنی کتابِ پاک میں ایسی باتوں کو کھول کر بیان کرے۔ اس لیے یہاں پردے پردے ہی میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا اور اہلِ کتاب نے اسے بنا کیا دیا ہے۔ اصل واقعہ جو قرآنِ مجید کے مذکورۂ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اُوریاہ (یا جو کچھ بھی اُس شخص کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اور چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرماں روا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیّت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی، اس لیے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔ اس موقع پر، قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤدؑ کی فرمایش کی تعمیل کرتا، قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے ایک فرضی مُقدّمے کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت داؤدؑ ابتدا میں تو یہ سمجھے کہ یہ واقعی کوئی مُقدّمہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسے سُن کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ لیکن زبان سے فیصلے کے الفاظ نکلتے ہی ان کے ضمیر نے تنبیہ کی کہ یہ تمثیل پوری طرح اُن کے اور اُس شخص کے معاملے پر چسپاں ہوتی ہے، اور جس فعل کو وہ ظلم قرار دے رہے ہیں اُس کا صُدور خود اُن سے اُس شخص کے معاملے میں ہو رہا ہے۔ یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدے میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے اس فعل سے رُجوع فرما لیا۔

بائبل میں اس واقعے کی وہ گِھناؤنی شکل کیسے بنی؟ یہ بات بھی تھوڑے سے غور کے بعد سمجھ میں آجاتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کو اُس خاتون کی خوبیوں کا کسی ذریعے سے علم ہو گیا تھا اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ایسی لائق عورت ایک معمولی افسر کی بیوی ہونے کے بجائے مُلک کی مَلِکہ ہونی چاہیے۔ اسی خیال سے مغلوب ہو کر انھوں نے اس کے شوہر سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ اس میں کوئی قباحت انھوں نے اس لیے محسوس نہ کی کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ اُن کے ہاں یہ ایک معمولی بات تھی کہ ایک شخص اگر کسی کی بیوی کو پسند کرتا تو بے تکلف

QuranUrdu.com

اس سے درخواست کر دیتا تھا کہ اسے میرے لیے چھوڑ دے۔ ایسی درخواست پر کوئی بُرا نہ مانتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات دوست ایک دوسرے کے پاسِ خاطر سے بیوی کو خود طلاق دے دیتے تھے تاکہ دوسرا اس سے شادی کر لے۔ لیکن یہ بات کرتے وقت حضرت داؤدؑ کو اس اِمر کا احساس نہ ہوا کہ ایک عام آدمی کی طرف سے اس طرح کی خواہش کا اظہار تو جبر و ظلم کے عُنصُر سے خالی ہو سکتا ہے، مگر ایک فرماں روا کی طرف سے جب ایسی خواہش ظاہر کی جائے تو وہ جبر سے کسی طرح بھی خالی نہیں ہو سکتی۔ اس پہلو کی طرف جب اُس تمثیلی مُقدّمے کے ذریعے سے ان کو توجُّہ دلائی گئی تو وہ بلا تأمُّل اپنی اس خواہش سے دست بردار ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر بعد میں کسی وقت جب ان کی کسی خواہش اور کوشش کے بغیر اُس خاتون کا شوہر ایک جنگ میں شہید ہو گیا، اور انھوں نے اس سے نکاح کر لیا، تو یہودیوں کے خبیث ذہن نے افسانہ تراشی شروع کر دی، اور یہ خُبثِ نفس اُس وقت اور زیادہ تیزی سے کام کرنے لگا جب بنی اسرائیل کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا دشمن ہو گیا۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حاشیہ ۵۶) اِن مُحرّکات کے زیرِ اثر یہ قصہ تصنیف کر ڈالا گیا کہ حضرت داؤدؑ نے، معاذ اللہ! اُورِیّاہ کی بیوی کو اپنے محل کی چھت پر سے اس حالت میں دیکھ لیا تھا کہ وہ برہنہ نہا رہی تھی۔ انھوں نے اس کو اپنے ہاں بلوایا اور اس سے زِنا کا ارتکاب کیا جس سے وہ حاملہ ہو گئی۔ پھر انھوں نے اُورِیّاہ کو بنی عمّون کے مقابلے پر جنگ میں بھیج دیا اور فوج کے کمانڈر ریوآب کو حکم دیا کہ اسے لڑائی میں ایسی جگہ مقرر کر دے جہاں وہ لازماً مارا جائے۔ اور جب وہ مارا گیا تو انہوں نے اس کی بیوی سے شادی کر لی، اور اسی عورت کے پیٹ سے سلیمان (علیہ السلام) پیدا ہوئے۔ یہ تمام جھوٹے الزامات ظالموں نے اپنی ''کتابِ مقدس'' میں ثبت کر دیے ہیں، تاکہ نسلاً بعد نسلٍ اسے پڑھتے رہیں اور اپنی قوم کے اُن دو بزرگ ترین انسانوں کی تذلیل کرتے رہیں جو حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کے سب سے بڑے مُحسن تھے۔

قرآنِ مجید کے مفسرین میں سے ایک گروہ نے تو اُن افسانوں کو قریب قریب جُوں کا تُوں قبول کر لیا ہے جو بنی اسرائیل کے ذریعے سے ان تک پہنچے ہیں۔ اسرائیلی روایات کا صرف اتنا حصّہ انھوں نے ساقط کیا ہے جس میں حضرت داؤدؑ پر زِنا کا الزام لگایا گیا تھا اور عورت کے حاملہ ہو جانے کا ذکر تھا۔ باقی سارا قصہ اُن کی نقل کردہ رِوایات میں اسی طرح پایا جاتا ہے جس طرح وہ بنی اسرائیل میں مشہور تھا۔ دوسرے گروہ نے سرے سے اس واقعہ ہی کا انکار کر دیا ہے کہ حضرت داؤدؑ سے کوئی ایسا فعل صادر ہوا تھا جو دنبیوں والے مُقدّمے سے کوئی مُماثَلت رکھتا ہو۔ اس کے بجائے وہ اپنی طرف سے اِس قصّے کی ایسی تاویلات کرتے ہیں جو بالکل بے بنیاد ہیں، جن کا کوئی ماخذ نہیں ہے، اور خود قرآن کے سیاق وسباق سے بھی وہ کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ لیکن مفسرین ہی میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک بات تک پہنچا ہے اور قرآن کے واضح اشارات سے قصّے کی اصل حقیقت پا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اقوال مُلاحظہ ہوں:

مَسرُوقؒ اور سعید بن جُبیرؒ، دونوں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ''حضرت داؤدؑ نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا کہ اُس عورت کے شوہر سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اپنی بیوی کو میرے لیے چھوڑ دے۔'' (ابنِ جَرِیر)

علامۂ زَمخشری اپنی تفسیر کشّاف میں لکھتے ہیں کہ ''جس شکل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کا قصہ بیان فرمایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اُس شخص سے صرف یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اُن کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑ دے۔''

علامۂ ابوبکر جَصّاصؒ اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ عورت اس شخص کی منکوحہ نہیں بلکہ صرف مخطوبہ یا منسوبہ تھی، حضرت داؤدؑ نے اسی عورت سے نکاح کا پیغام دے دیا، اس پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا کیونکہ انھوں نے اپنے مومن بھائی کے پیغام پر

QuranUrdu.com

پیغام دیا تھا حالانکہ ان کے گھر میں پہلے سے کئی بیویاں موجود تھیں۔(احکام القرآن) بعض دوسرے مفسرین نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔لیکن یہ بات قرآن کے بیان سے پوری مطابقت نہیں رکھتی۔قرآنِ مجید میں مُقدّمہ پیش کرنے والے کے جو الفاظ نقل ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ: لِیَ نَعۡجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكۡفِلۡنِيۡهَا ''میرے پاس بس ایک ہی دُنبی ہے اور یہ کہتا ہے کہ اسے میرے حوالے کردے۔'' یہی بات حضرت داؤدؑ نے بھی اپنے فیصلے میں ارشاد فرمائی کہ لَقَدۡ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعۡجَتِكَ ''اس نے تیری دُنبی مانگنے میں تجھ پر ظلم کیا۔'' یہ تمثیل حضرت داؤدؑ اور اُوریّاہ کے معاملے پر اسی صورت میں چسپاں ہوسکتی ہے، جب کہ وہ عورت اُس شخص کی بیوی ہو۔ پیغام پر پیغام دینے کا معاملہ ہوتا تو پھر تمثیل یوں ہوتی کہ'' میں ایک دُنبی لینا چاہتا تھا اور اس نے کہا کہ یہ بھی میرے لیے چھوڑ دے۔''

قاضی ابوبکر ابن العَرَبیؒ احکام القرآن میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اصل واقعہ بس یہی ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اپنے آدمیوں میں سے ایک شخص سے کہا کہ میرے لیے اپنی بیوی چھوڑ دے، اور سنجیدگی کے ساتھ یہ مطالبہ کیا...... قرآن میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ شخص ان کے اس مطالبے پر اپنی بیوی سے دست بردار ہوگیا اور حضرت داؤدؑ نے اس عورت سے اس کے بعد شادی کر لی اور حضرت سلیمانؑ اسی کے بطن سے پیدا ہوئے...... جس بات پر عتاب ہوا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انھوں نے ایک عورت کے شوہر سے یہ چاہا کہ وہ ان کی خاطر اسے چھوڑ دے...... یہ فعل خواہ فی الجملہ جائز ہی ہو مگر منصبِ نبوت سے بعید تھا، اسی لیے اُن پر عتاب بھی ہوا اور ان کو نصیحت بھی کی گئی۔''

یہی تفسیر اُس سیاق وسباق سے بھی مناسبت رکھتی ہے جس میں یہ قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ سلسلۂ کلام پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ قرآنِ مجید میں اِس مَقام پر یہ قصّہ دو اغراض کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ پہلی غرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے آپؐ کو مخاطَب کرکے فرمایا گیا ہے کہ'' جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور ہمارے بندے داؤدؑ کو یاد کرو۔'' یعنی تمھیں تو ساحر اور کذّاب ہی کہا جا رہا ہے، لیکن ہمارے بندے داؤدؑ پر تو ظالموں نے زِنا اور سازشی قتل تک کے الزامات لگا دیے، لہٰذا اِن لوگوں سے جو کچھ بھی تم کو سننا پڑے اُسے برداشت کرتے رہو۔ دوسری غرض کفار کو یہ بتانا ہے کہ تم لوگ ہر محاسبے سے بے خوف ہو کر دنیا میں طرح طرح کی زیادتیاں کرتے چلے جاتے ہو، لیکن جس خدا کی خدائی میں تم یہ حرکتیں کر رہے ہو وہ کسی کو بھی محاسبہ کیے بغیر نہیں چھوڑتا، حتّٰی کہ جو بندے اس کے نہایت محبُوب و مقرَّب ہوتے ہیں، وہ بھی اگر ایک ذرا سی لغزش کے مرتکب ہو جائیں تو خداوندِ عالَم اُن سے سخت مواخذہ کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ ان کے سامنے ہمارے بندے داؤدؑ کا قصّہ بیان کرو جو ایسی اور ایسی خوبیوں کا مالک تھا، مگر جب اس سے ایک بے جا بات سرزد ہو گئی تو دیکھو کہ ہم نے اسے کس طرح سرزنش کی۔

اس سلسلے میں ایک غلط فہمی اور باقی رہ جاتی ہے جسے رفع کردینا ضروری ہے۔ تمثیل میں مُقدّمہ پیش کرنے والے نے یہ جو کہا ہے کہ اس شخص کے پاس ۹۹ دُنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے جسے یہ مانگ رہا ہے، اس سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید حضرت داؤدؑ کے پاس ۹۹ بیویاں تھیں اور وہ ایک عورت حاصل کرکے ۱۰۰ کا عدد پورا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دراصل تمثیل کے ہر ہر جُز کا حضرت داؤدؑ اور اُوریّاہ حتّٰی کے معاملے پر لفظ بلفظ چسپاں ہونا ضروری نہیں ہے۔ عام محاورے میں

QuranUrdu.com

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِیْنَ
كَفَرُوْا ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ﴿۲۷﴾ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؗ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ

ہم نے اس آسمان اور زمین کو، اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے۔[29] یہ تو اُن لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا ہے، اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنّم کی آگ سے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا متّقیوں کو ہم

دس، بیس، پچاس وغیرہ اعداد کا ذکر صرف کثرت کو بیان کرنے کے لیے کیا جاتا ہے نہ کہ ٹھیک تعداد بیان کرنے کے لیے۔ ہم جب کسی سے کہتے ہیں کہ دس مرتبہ تم سے فُلاں بات کہہ دی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دس بار گن کر وہ بات کہی گئی ہے، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ بارہا وہ بات کہی جا چکی ہے۔ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی ہے۔ تمثیلی مُقدّمے میں وہ شخص حضرت داؤدؑ کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ آپ کے پاس متعدّد بیویاں ہیں، اور پھر بھی آپ دوسرے شخص کی ایک بیوی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہی بات مفسر نیسابُوریؒ نے حضرت حَسَنؒ بصری سے نقل کی ہے کہ لم یکن لداؤد تسع وتسعون امرأۃ وانما ھٰذا مثل۔ ”حضرت داؤدؑ کی ۹۹ بیویاں نہ تھیں بلکہ یہ صرف ایک تمثیل ہے۔“

(اس قصّے پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب تفہیمات حصہ دوم میں کی ہے۔ جو اصحاب ہماری بیان کردہ تاویل کی ترجیح کے مفصّل دلائل معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کے صفحات ۲۹ تا ۴۴ مُلاحظہ فرمائیں۔)

۲۹ – یعنی محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ہے کہ اس میں کوئی حکمت نہ ہو، کوئی غرض اور مقصد نہ ہو، کوئی عدل اور انصاف نہ ہو، اور کسی اچھے یا بُرے فعل کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ یہ ارشاد پچھلی تقریر کا ماحَصل بھی ہے اور آگے کے مضمون کی تمہید بھی۔ پچھلی تقریر کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے سے مقصود یہ حقیقت سامعین کے ذہن نشین کرانا ہے کہ انسان یہاں شُترِ بے مہار کی طرح نہیں چھوڑ دیا گیا ہے، نہ یہ دُنیا اندھیر نگری ہے کہ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے اور اُس پر کوئی باز پُرس نہ ہو۔ آگے کے مضمون کی تمہید کے طور پر اس فقرے سے کلام کا آغاز کر کے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جو شخص جزا و سزا کا قائل نہیں ہے اور اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ نیک و بد سب آخرِ کار مر کر مٹی ہو جائیں گے، کسی سے کوئی محاسبہ نہ ہوگا، نہ کسی کو بھلائی یا بُرائی کا کوئی بدلہ ملے گا، وہ دراصل دنیا کو ایک کھلونا اور اس کے بنانے والے کو کھلنڈرا سمجھتا ہے اور اس کا خیال یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے دنیا بنا کر اور اس میں انسان کو پیدا کر کے ایک فعلِ عَبَث کا اِرتکاب کیا ہے۔ یہی بات قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر مختلف طریقوں سے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿﴾ (المومنون: ۱۱۵)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو فضول پیدا کر دیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹائے جانے والے نہیں ہو؟

QuranUrdu.com

كَالْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ
اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٩﴾ وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿٣٠﴾ اِذْ
عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿٣١﴾ فَقَالَ اِنِّىْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ

فاجروں جیسا کر دیں[۳۰]؟ ــــــ یہ ایک بڑی برکت والی کتاب[۳۱] ہے جو (اَے محمدؐ!) ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔

اور داوٗدؑ کو ہم نے سلیمانؑ (جیسا بیٹا) عطا کیا[۳۲]، بہترین بندہ، کثرت سے اپنے رب کی طرف رُجوع کرنے والا۔ قابلِ ذکر ہے وہ موقع جب شام کے وقت اس کے سامنے خوب سدھے ہوئے تیز رَو گھوڑے پیش کیے گئے[۳۳] تو اس نے کہا: ''میں نے اس مال[۳۴] کی محبّت اپنے رب کی

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ (الدخان: ۳۸-۴۰)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور اس کائنات کو جو ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔ ہم نے ان کو برحق پیدا کیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ درحقیقت فیصلے کا دن اِن سب کے لیے حاضری کا وقتِ مقرر ہے۔

۳۰- یعنی کیا تمھارے نزدیک یہ بات معقول ہے کہ نیک اور بد دونوں آخر کار یکساں ہو جائیں؟ کیا یہ تصور تمھارے لیے اطمینان بخش ہے کہ کسی نیک انسان کو اس کی نیکی کا کوئی صلہ اور کسی بد آدمی کو اس کی بدی کا کوئی بدلہ نہ ملے؟ ظاہر بات ہے کہ اگر آخرت نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مُحاسَبہ نہ ہو اور انسانی افعال کی کوئی جزا و سزا نہ ہو تو اس سے اللہ کی حکمت اور اس کے عدل دونوں کی نفی ہو جاتی ہے اور کائنات کا پورا نظام ایک اندھا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ اس مفروضے پر تو دنیا میں بھلائی کے لیے کوئی مُحرّک اور بُرائی سے روکنے کے لیے کوئی مانع سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتا۔ خدا کی خدائی اگر، معاذ اللہ! ایسی ہی اندھیر نگری ہو تو پھر وہ شخص بے وقوف ہے جو اس زمین پر تکلیفیں اُٹھا کر خود صالح زندگی بسر کرتا ہے اور خَلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کرتا ہے، اور وہ شخص عقل مند ہے جو سازگار مواقع پا کر ہر طرح کی زیادتیوں سے فائدے سمیٹتا اور ہر قسم کے فِسق و فُجور سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

۳۱- برکت کے لُغوی معنیٰ ہیں: ''افزایشِ خیر و سعادت''۔ قرآنِ مجید کو برکت والی کتاب کہنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ انسان کے لیے نہایت مفید کتاب ہے، اُس کی زندگی کو دُرست کرنے کے لیے بہترین ہدایات دیتی ہے، اس کی پیروی میں آدمی کا نفع ہی نفع ہے، نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

QuranUrdu.com

عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝۳۲ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۭ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ۝۳۳ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ

یاد کی وجہ سے اختیار کی ہے۔" یہاں تک کہ جب وہ گھوڑے نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو (اس نے حکم دیا کہ) انھیں میرے پاس واپس لاؤ، پھر لگا ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے ۳۵۔ اور (دیکھو کہ) سلیمانؑ کو بھی ہم نے آزمائش

۳۲۔ حضرت سلیمانؑ کا ذکر اس سے پہلے حسبِ ذیل مقامات پر گزر چکا ہے: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۰۴۔ جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۷۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷۰ تا ۷۵، النمل، حواشی ۱۸ تا ۵۶، سورۂ سبا، آیات ۱۲-۱۴۔

۳۳۔ اصل الفاظ ہیں: اَلصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ۔ اس سے مراد ایسے گھوڑے ہیں جو کھڑے ہوں تو نہایت سُکون کے ساتھ کھڑے رہیں، کوئی اُچھل کُود نہ کریں، اور جب دوڑیں تو نہایت تیز دوڑیں۔

۳۴۔ اصل میں لفظ خَیْر استعمال ہوا ہے جو عَرَبی زبان میں مالِ کثیر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور گھوڑوں کے لیے بھی مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان گھوڑوں کو چونکہ راہِ خدا میں جہاد کے لیے رکھا تھا، اس لیے انھوں نے "خیر" کے لفظ سے ان کو تعبیر فرمایا۔

۳۵۔ ان آیات کے ترجمہ اور تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک گروہ ان کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کے مُعائنے اور ان کی دَوڑ کے مُلاحظہ میں اس قدر مشغول ہوئے کہ نمازِ عصر بُھول گئے، یا بقولِ بعض اپنا کوئی خاص وظیفہ پڑھنا بھول گئے جو وہ عصر و مغرب کے درمیان پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ سورج چُھپ گیا۔ تب انھوں نے حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو واپس لاؤ، اور جب وہ واپس آئے تو حضرت سلیمانؑ نے تلوار لے کر ان کو کاٹنا، یا بالفاظِ دیگر، اللہ کے لیے اُن کو قربان کرنا شروع کر دیا کیونکہ وہ ذکرِ الٰہی سے غفلت کے موجب بن گئے تھے۔ اس مطلب کے لحاظ سے ان آیات کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے: "تو اس نے کہا: مَیں نے اس مال کی مَحبّت کو ایسا پسند کیا کہ اپنے رب کی یاد (نمازِ عصر، یا وظیفۂ خاص) سے غافل ہو گیا، یہاں تک کہ (سورج پردۂ مغرب میں) چھپ گیا۔ (پھر اس نے حکم دیا کہ) واپس لاؤ ان (گھوڑوں) کو (اور جب وہ واپس آئے) تو لگا اُن کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلوار کے) ہاتھ چلانے۔" یہ تفسیر اگرچہ بعض اکابر مفسرین نے کی ہے، لیکن یہ اس وجہ سے قابلِ ترجیح نہیں ہے کہ اس میں مفسر کو تین باتیں اپنی طرف سے بڑھانی پڑتی ہیں جن کا کوئی ماخذ نہیں ہے۔ اوّلاً، وہ فرض کرتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی نمازِ عصر اس شغل میں چھوٹ گئی، یا ان کا کوئی خاص وظیفہ چھوٹ گیا جو وہ اس وقت پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ صرف یہ ہیں: اِنِّیْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ۔ اِن الفاظ کا ترجمہ یہ تو کیا جا سکتا ہے کہ "میں نے اس مال کو اتنا پسند کیا کہ اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا"، لیکن ان میں نمازِ عصر یا کوئی خاص وظیفہ مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ نہیں ہے۔ ثانیاً، وہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ سورج چھپ گیا، حالانکہ وہاں سورج کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ کے الفاظ پڑھ کر آدمی کا ذہن بلا تأمُّل اَلصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ کی

QuranUrdu.com

طرف پھرتا ہے جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہو چکا ہے۔ ثالثاً، وہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر خالی مسح نہیں کیا بلکہ تلوار سے مسح کیا، حالانکہ قرآن میں مَسْحًا بِالسَّيْفِ کے الفاظ نہیں ہیں، اور کوئی قرینہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جس کی بنا پر مسح بالسیف مراد لیا جا سکے۔ ہمیں اس طریقِ تفسیر سے اُصُولی اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن کے الفاظ سے زائد کوئی مطلب لینا چار ہی صورتوں میں دُرست ہو سکتا ہے۔ یا تو قرآن ہی کی عبارت میں اس کے لیے کوئی قرینہ موجود ہو، یا قرآن میں کسی دوسرے مقام پر اس کی طرف کوئی اشارہ ہو، یا کسی صحیح حدیث میں اس اِجمال کی شرح ملتی ہو، یا اس کا اور کوئی قابلِ اعتبار ماخذ ہو، مثلاً تاریخ کا معاملہ ہے تو تاریخ میں اس اِجمال کی تفصیلات ملتی ہوں، آثارِ کائنات کا ذکر ہے تو مستند علمی تحقیقات سے اس کی تشریح ہو رہی ہو، اور احکامِ شرعیّہ کا معاملہ ہے تو فقہِ اسلامی کے مآخذ اس کی وضاحت کر رہے ہوں۔ جہاں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو وہاں محض بطورِ خود ایک قصہ تصنیف کر کے قرآن کی عبارت میں شامل کر دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

ایک گروہ نے مذکورۂ بالا ترجمہ وتفسیر سے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ اور رُدُّوْهَا عَلَيَّ، دونوں کی ضمیر سورج ہی کی طرف پھرتی ہے۔ یعنی جب نمازِ عصر فوت ہو گئی اور سورج پردۂ مغرب میں چھپ گیا تو حضرت سلیمانؑ نے کارکنانِ قضا وقدر سے کہا کہ پھیر لاؤ سورج کو، تا کہ عصر کا وقت واپس آ جائے اور میں نماز ادا کر لوں، چنانچہ سورج پلٹ آیا اور انھوں نے نماز پڑھ لی۔ لیکن یہ تفسیر اُوپر والی تفسیر سے بھی زیادہ ناقابلِ قبول ہے۔ اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ سورج کو واپس لانے پر قادر نہیں ہے، بلکہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا قطعاً کوئی ذکر نہیں فرمایا ہے، حالانکہ حضرت سلیمانؑ کے لیے اتنا بڑا معجزہ صادر ہوا ہوتا تو وہ ضرور قابلِ ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اور اس لیے بھی کہ سورج کا غُروب ہو کر پلٹ آنا ایسا غیر معمولی واقعہ ہے کہ اگر وہ درحقیقت پیش آیا ہوتا تو دنیا کی تاریخ اس کے ذکر سے ہرگز خالی نہ رہتی۔ اس تفسیر کی تائید میں یہ حضرات بعض احادیث بھی پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سُورج کا غروب ہو کر دوبارہ پلٹ آنا ایک ہی دفعہ کا واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ کئی دفعہ پیش آیا ہے۔ قصۂ معراج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سورج کے واپس لائے جانے کا ذکر ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر بھی حضورؐ کے لیے وہ واپس لایا گیا۔ اور حضرت علیؓ کے لیے بھی، جب کہ حضورؐ ان کی گود میں سر رکھے سو رہے تھے اور ان کی نمازِ عصر قضا ہو گئی تھی، حضورؐ نے سورج کی واپسی کی دعا فرمائی تھی اور وہ پلٹ آیا تھا۔ لیکن اِن روایات سے اِستدلال اُس تفسیر سے بھی زیادہ کمزور ہے جس کی تائید کے لیے انھیں پیش کیا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کے متعلق جو رِوایت بیان کی جاتی ہے اس کے تمام طُرُق اور رِجال پر تفصیلی بحث کر کے ابنِ تَیمِیہؒ نے اسے موضوع ثابت کیا ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اور ابنِ جوزی کہتے ہیں کہ وہ بلاشک وشبہ موضوع ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر سورج کی واپسی والی رِوایَت بھی بعض محدثین کے نزدیک ضعیف اور بعض کے نزدیک موضوع ہے۔ رہی قصۂ معراج والی رِوایَت، تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ مکہ سے شبِ معراج کے حالات بیان فرما رہے تھے تو کفار نے آپؐ سے ثبوت طلب کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ بیت المقدس کے راستے میں فُلاں مقام پر ایک قافلہ ملا تھا جس کے ساتھ فلاں واقعہ پیش آیا تھا۔ کفار نے پوچھا: وہ قافلہ کس روز مکہ پہنچے گا۔ آپؐ نے فرمایا: فلاں روز۔ جب وہ دن آیا تو قریش کے لوگ دن بھر قافلے کا انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ شام ہونے کو آ گئی۔ اس موقع پر حضورؐ نے دُعا کی کہ دن اس وقت تک غروب نہ ہو

QuranUrdu.com

وَ اَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا۔ پھر اس نے رُجوع کیا اور کہا کہ "اے میرے رب! مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو، بیشک تُو ہی اصل داتا ہے۔"[۳۶]

جب تک قافلہ نہ آ جائے۔ چنانچہ فی الواقع سورج ڈوبنے سے پہلے وہ پہنچ گیا۔ اس واقعے کو بعض راویوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اُس روز دن میں ایک گھنٹے کا اضافہ کر دیا گیا اور سورج اتنی دیر تک کھڑا رہا۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی روایات کیا اتنے بڑے غیر معمولی واقعے کے ثبوت میں کافی شہادت ہیں؟ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، سورج کا پلٹ آنا، یا گھنٹا بھر کا رہنا کوئی معمولی واقعہ تو نہیں ہے۔ ایسا واقعہ اگر فی الواقع پیش آ گیا ہوتا تو دنیا بھر میں اس کی دُھوم مچ گئی ہوتی۔ بعض اخبارِ آحاد تک اس کا ذکر کیسے محدود رہ سکتا تھا؟

مفسرین کا تیسرا گروہ ان آیات کا وہی مفہوم لیتا ہے جو ایک خالی الذہن آدمی اس کے الفاظ پڑھ کر اس سے سمجھ سکتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق واقعہ بس اس قدر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جب اعلیٰ درجے کے اصیل گھوڑوں کا ایک دستہ پیش کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: یہ مال مجھے کچھ اپنی بڑائی کی غرض سے یا اپنے نفس کی خاطر محبوب نہیں ہے بلکہ اِن چیزوں سے دلچسپی کو میں اپنے رب کا کلمہ بلند کرنے کے لیے پسند کرتا ہوں۔ پھر انھوں نے ان گھوڑوں کی دوڑ کرائی یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اُن کو واپس طلب فرمایا اور جب وہ آئے تو بقول ابنِ عباسؓ: جعل يمسح اعراف الخيل وعراقيبها حُبًّا لها، "حضرت اُن کی گردنوں پر اور ان کی پنڈلیوں پر محبّت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔" یہی تفسیر ہمارے نزدیک صحیح ہے، کیونکہ یہ قرآنِ مجید کے الفاظ سے پوری مطابقت رکھتی ہے اور مطلب کی تکمیل کے لیے اس میں ایسی کوئی بات بڑھانی نہیں پڑتی جو نہ قرآن میں ہو، نہ کسی صحیح حدیث میں اور نہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں۔

یہ بات بھی اس موقع پر نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اس واقعے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کے حق میں نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف کثرت سے رُجوع کرنے والا) کے تعریفی کلمات ارشاد فرمانے کے معاً بعد کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دراصل یہ بتانا ہے کہ دیکھو، وہ ہمارا ایسا اچھا بندہ تھا، بادشاہی کا سروسامان اُس کو دنیا کی خاطر نہیں بلکہ ہماری خاطر پسند تھا، اپنے شاندار رسالے کو دیکھ کر دنیا پرست فرماں رواؤں کی طرح اس نے ڈینگیں نہ ماریں بلکہ اُس وقت بھی ہم ہی اُسے یاد آئے۔

۳۶ — سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اِس جگہ اصل مقصد یہی واقعہ بیان کرنا ہے اور پچھلی آیات اسی کے لیے بطور تمہید ارشاد ہوئی ہیں۔ جس طرح پہلے حضرت داؤدؑ کی تعریف کی گئی، پھر اُس واقعے کا ذکر کیا گیا جس میں وہ مبتلائے فتنہ ہو گئے تھے، یہ بتایا گیا کہ اللہ جَلَّ شانُہٗ نے اپنے ایسے محبُوب بندے کو بھی مُحاسبہ کیے بغیر نہ چھوڑا، پھر ان کی یہ شان دکھائی گئی کہ فتنے پر مُتنبِّہ

QuranUrdu.com

ہوتے ہی وہ تائب ہوگئے اور اللہ کے آگے جھک کر انھوں نے اپنے اس فعل سے رُجوع کر لیا، اسی طرح یہاں بھی ترتیب کلام یہ ہے کہ پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مرتبۂ بلند اور شانِ بندگی کا ذکر کیا گیا ہے، پھر بتایا گیا ہے کہ ان کو بھی آزمائش میں ڈالا گیا، پھر اُن کی یہ شانِ بندگی دکھائی گئی ہے کہ جب ان کی کرسی پر ایک جَسَد لا کر ڈال دیا گیا تو وہ فوراً ہی اپنی لغزش پر مُتَنَبِّہ ہو گئے اور اپنے رب سے معافی مانگ کر انھوں نے اپنی اُس بات سے رُجوع کر لیا جس کی وجہ سے وہ فتنے میں پڑے تھے۔ بالفاظِ دیگر، اللہ تعالیٰ ان دونوں قصّوں سے بیک وقت دو باتیں ذہن نشین کرانا چاہتا ہے: ایک، یہ کہ اس کے بے لاگ مُحاسبے سے انبیا تک نہیں بچ سکے ہیں، تابدیگراں چہ رَسَد۔ دوسرے یہ کہ بندے کے لیے صحیح رَوِیّہ قصور کر کے اکڑنا نہیں ہے بلکہ اُس کا کام یہ ہے کہ جس وقت بھی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اُسی وقت وہ عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جائے۔ اسی رَوِیّے کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی لغزشوں کو محض معاف ہی نہیں کیا بلکہ ان کو اور زیادہ الطاف و عنایات سے نوازا۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فتنہ کیا تھا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام پڑ گئے تھے؟ اور ان کی کرسی پر ایک جَسَد لا کر ڈال دینے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس جَسَد کا لا کر ڈالا جانا اُن کے لیے کس نوعیت کی تنبیہ تھی جس پر انھوں نے توبہ کی؟ اس کے جواب میں مفسرین نے چار مختلف مسلک اختیار کیے ہیں۔

ایک گروہ نے ایک لمبا چوڑا افسانہ بیان کیا ہے جس کی تفصیلات میں ان کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہیں۔ مگر سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے یا تو یہ قصور ہوا تھا کہ ان کے محل میں ایک بیگم چالیس دن تک بُت پرستی کرتی رہی اور وہ اس سے بے خبر رہے، یا یہ کہ وہ چند روز تک گھر میں بیٹھے رہے اور کسی مظلوم کی دادرسی نہ کی۔ اس پر ان کو یہ سزا ملی کہ ایک شیطان کسی نہ کسی طرح ان کی وہ انگوٹھی اُڑا لے گیا جس کی بدولت وہ جنّ و اِنس اور ہواؤں پر حکومت کرتے تھے۔ انگوٹھی ہاتھ سے جاتے ہی حضرت سلیمانؑ کا سارا اقتدار چھن گیا اور وہ چالیس دن تک دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اور اس دَوران میں وہ شیطان سلیمانؑ بنا ہوا حکمرانی کرتا رہا۔ سلیمانؑ کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دینے سے مراد یہی شیطان ہے جو ان کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ بعض حضرات یہاں تک بھی کہہ گزرتے ہیں کہ اس زمانے میں اُس شیطان سے حَرَمِ سلیمانی کی خواتین تک کی عِصمت محفوظ نہ رہی۔ آخرِکار سلطنت کے اَعیان و اکابر اور عُلَما کو اس کی کارروائیاں دیکھ کر شک ہو گیا کہ یہ سلیمان نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے سامنے تورات کھولی اور وہ ڈر کر بھاگ نکلا۔ راستے میں انگوٹھی اس کے ہاتھ سے سمندر میں گر گئی، یا خود اُسی نے پھینک دی، اور اسے ایک مچھلی نے نِگل لیا۔ پھر اتفاق سے وہ مچھلی حضرت سلیمانؑ کو مل گئی۔ اُسے پکانے کے لیے انھوں نے اس کا پیٹ جو چاک کیا تو انگوٹھی نکل آئی اور اس کا ہاتھ آنا تھا کہ جنّ و اِنس سب سلام کرتے ہوئے اُن کے سامنے حاضر ہو گئے۔۔۔۔ یہ پورا افسانہ از سرتاپا خُرافات پر مشتمل ہے جنھیں نَو مسلم اہلِ کتاب نے تَلْمُود اور دوسری اسرائیلی رِوایات سے اخذ کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیا تھا اور حیرت ہے کہ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے لوگوں نے ان کو قرآن کے مُجْمَلات کی تفصیلات سمجھ کر اپنی زبان سے نقل کر دیا۔ حالانکہ نہ اَنگشتریِ سلیمانی کی کوئی حقیقت ہے، نہ حضرت سلیمانؑ کے کمالات کسی انگشتری کے کرشمے تھے، نہ شیاطین کو اللہ نے یہ قدرت دی ہے کہ انبیا کی شکل بنا کر آئیں اور خلقِ خدا کو گمراہ کریں، اور نہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصوُّر کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نبی کے قصور کی سزا ایسی فتنہ انگیز شکل میں دے جس سے شیطان نبی بن کر ایک پوری اُمت کا ستیاناس کر دے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن خود اِس تفسیر کی تردید کر رہا ہے۔

QuranUrdu.com

آگے کی آیات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب یہ آزمائش حضرت سلیمانؑ کو پیش آئی اور انھوں نے ہم سے معافی مانگ لی تب ہم نے ہوا اور شیاطین کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔ لیکن یہ تفسیر اس کے برعکس یہ بتا رہی ہے کہ شیاطین پہلے ہی انگشتری کے طفیل حضرت سلیمانؑ کے تابع فرمان تھے۔ تعجب ہے کہ جن بزرگوں نے یہ تفسیر بیان کی ہے انھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ بعد کی آیات کیا کہہ رہی ہیں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے ہاں ۲۰ سال کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا۔ شیاطین کو خطرہ ہوا کہ اگر سلیمانؑ کے بعد یہ بادشاہ ہو گیا تو ہم پھر اسی غلامی میں مبتلا رہیں گے، اس لیے انھوں نے اسے قتل کر دینے کی ٹھانی۔ حضرت سلیمانؑ کو اس کا علم ہو گیا اور انھوں نے اس لڑکے کو بادلوں میں چھپا دیا، تاکہ وہیں اس کی پرورش ہوتی رہے۔ یہی وہ فتنہ تھا جس میں حضرت مبتلا ہوئے تھے کہ انھوں نے اللہ پر توکّل کرنے کے بجائے بادلوں کی حفاظت پر اعتماد کیا۔ اس کی سزا ان کو یہ دی گئی کہ وہ بچہ مر کر ان کی کرسی پر آ گرا ـــــ یہ افسانہ بھی بالکل بے سروپا اور صریح قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ اس میں بھی یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہوائیں اور شیاطین پہلے سے حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخَّر تھے، حالانکہ قرآن صاف الفاظ میں ان کی تسخیر کو اس فتنے کے بعد کا واقعہ بتا رہا ہے۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک روز قسم کھائی کہ آج رات میں اپنی ستّر بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر ایک سے ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہو گا، مگر یہ بات کہتے ہوئے انھوں نے اِن شاء اللہ نہ کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک بیوی حاملہ ہوئیں اور ان سے بھی ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا جسے دائی نے لا کر حضرت سلیمانؑ کی کرسی پر ڈال دیا۔ یہ حدیث حضرت ابوہُرَیرہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رِوایَت کی ہے اور اسے بخاری و مسلم اور دوسرے محدثین نے متعدِّد طریقوں سے نقل کیا ہے۔ خود بخاری میں مختلف مقامات پر یہ رِوایَت جن طریقوں سے نقل کی گئی ہے ان میں سے کسی میں بیویوں کی تعداد ۶۰ بیان کی گئی ہے، کسی میں ۷۰، کسی میں ۹۰، کسی میں ۹۹، اور کسی میں ۱۰۰۔ جہاں تک اِسناد کا تعلق ہے، ان میں سے اکثر رِوایات کی سَنَد قوی ہے، اور باعتبارِ رِوایَت اس کی صحّت میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حدیث کا مضمون صریح عقل کے خلاف ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہرگز نہ فرمائی ہو گی جس طرح وہ نقل ہوئی ہے۔ بلکہ آپؐ نے غالباً یہود کی یاوہ گوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقع پر اسے بطورِ مثال بیان فرمایا ہو گا، اور سامع کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ اس بات کو حضورؐ خود بطورِ واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔ ایسی رِوایات کو محض صحتِ سند کے زور پر لوگوں کے حلق سے اُتروانے کی کوشش کرنا دین کو مضحکہ بنانا ہے۔ ہر شخص خود حساب لگا کر دیکھ سکتا ہے کہ جاڑے کی طویل ترین رات میں بھی عشا اور فجر کے درمیان دس گیارہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اگر بیویوں کی کم سے کم تعداد ۶۰ ہی مان لی جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس رات بغیر دَم لیے فی گھنٹا ۶ بیوی کے حساب سے مسلسل دس گھنٹے یا ۱۱ گھنٹے مباشرت کرتے چلے گئے۔ کیا یہ عملاً ممکن بھی ہے؟ اور کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حضورؐ نے یہ بات واقعے کے طور پر بیان کی ہو گی؟ پھر حدیث میں یہ بات کہیں نہیں بیان کی گئی ہے کہ قرآنِ مجید میں حضرت سلیمانؑ کی کرسی پر جس جَسَد کے ڈالے جانے کا ذکر آیا ہے اس سے مراد یہی ادھورا بچہ ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حضورؐ نے یہ واقعہ اس آیت کی تفسیر کے طور پر بیان فرمایا تھا۔ علاوہ بریں اس بچّے کی پیدائش پر حضرت سلیمانؑ کا اِستِغفار کرنا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھوں نے اِستِغفار کے ساتھ یہ دعا

QuranUrdu.com

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ﴿٣٦﴾ وَ

تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخّر کر دیا جو اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی جدھر وہ چاہتا تھا،۳۷ اور

کیوں مانگی کہ ”مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو۔“

ایک اور تفسیر جس کو امام رازیؒ ترجیح دیتے ہیں یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کسی سخت مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، یا کسی خطرے کی وجہ سے اس قدر متفکر تھے کہ گھلتے گھلتے وہ بس ہڈی اور چمڑا بن کر رہ گئے تھے۔ لیکن یہ تفسیر قرآن کے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ ”ہم نے سلیمان کو آزمایش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا، پھر اس نے رُجوع کیا۔“ ان الفاظ کو پڑھ کر کوئی شخص بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس جسد سے مراد خود حضرت سلیمانؑ ہیں۔ ان سے تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزمایش میں ڈالے جانے سے مراد کوئی قصور ہے جو آنجناب سے صادر ہوا تھا، اس قصور پر آپ کو تنبیہ اس شکل میں فرمائی گئی کہ آپ کی کرسی پر ایک جسد لا ڈالا گیا، اور اس پر جب آپ کو اپنے قصور کا احساس ہوا تو آپ نے رُجوع فرما لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام قرآنِ مجید کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے اور حتمی طور پر اس کی کوئی تفسیر بیان کرنے کے لیے ہمیں کوئی یقینی بنیاد نہیں ملتی۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کی دعا کے یہ الفاظ کہ ”اے میرے رب! مجھے معاف کر دے اور مجھ کو وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو“، اگر تاریخِ بنی اسرائیل کی روشنی میں پڑھے جائیں تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں غالباً یہ خواہش تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہو اور حکومت و فرماں روائی آیندہ انھی کی نسل میں باقی رہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں ”فتنہ“ قرار دیا اور اس پر وہ اس وقت متنبہ ہوئے جب اُن کا ولی عہد رَحُبْعام، ایک ایسا نالائق نوجوان بن کر اُٹھا جس کے لچھن صاف بتا رہے تھے کہ وہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی سلطنت چار دن بھی نہ سنبھال سکے گا۔ اُن کی کرسی پر ایک جَسَد لا کر ڈالے جانے کا مطلب غالباً یہی ہے کہ جس بیٹے کو وہ اپنی کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے وہ ایک کُندۂ ناتراش تھا۔ تب انھوں نے اپنی اس خواہش سے رُجوع کیا، اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ کر درخواست کی کہ بس یہ بادشاہی مجھی پر ختم ہو جائے، میں اپنے بعد اپنی نسل میں بادشاہی جاری رہنے کی تمنا سے باز آیا۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے بعد کسی کے لیے بھی جانشینی کی نہ وصیت کی اور نہ کسی کی اطاعت کے لیے لوگوں کو پابند کیا۔ بعد میں ان کے اَعیانِ سلطنت نے رَحُبْعام کو تخت پر بٹھایا، مگر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ بنی اسرائیل کے دس قبیلے شمالی فلسطین کا علاقہ لے کر الگ ہو گئے اور صرف یہوداہ کا قبیلہ بیت المَقْدِس کے تخت سے وابستہ رہ گیا۔

۳۷- اس کی تشریح سورۂ انبیاء کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۱۷۶-۱۷۷) البتہ یہاں ایک بات وضاحت طلب ہے۔ سورۂ انبیاء میں جہاں حضرت سلیمانؑ کے لیے ہوا کو مسخر کرنے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اَلرِّيحَ عَاصِفَةً (بادِ تُند) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور یہاں اسی ہوا کے متعلق فرمایا گیا ہے: تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً (وہ اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی۔) اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہوا بجائے خود تو بادِ تُند تھی، جیسی کہ بادبانی جہازوں کو چلانے کے لیے درکار ہوتی ہے، مگر حضرت سلیمانؑ کے لیے وہ اس معنیٰ میں نرم بنا دی گئی تھی کہ جِدھر اُن کے تجارتی بیڑوں کو سفر کرنے کی ضرورت ہوتی تھی

QuranUrdu.com

الشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ لا وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾
هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا
لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾ ع وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ

وقف لازم ۳ ع ۱۴ ۱۲

شیاطین کو مسخّر کر دیا، ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابندِ سلاسِل تھے۔[۳۸] (ہم نے اُس سے کہا:) ''یہ ہماری بخشش ہے، تجھے اختیار ہے جسے چاہے دے اور جس سے چاہے روک لے، کوئی حساب نہیں۔''[۳۹] یقیناً اُس کے لیے ہمارے ہاں تقرُّب کا مقام اور بہتر انجام ہے۔[۴۰] ع

اور ہمارے بندے ایُّوبؑ کا ذکر کرو،[۴۱] جب اس نے اپنے رب کو پُکارا کہ شیطان نے مجھے

اُسی طرف وہ چلتی تھی۔

۳۸ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۵ – النمل، حواشی ۲۳ – ۲۸ – ۴۵ – ۴۶ – ۴۷ ـــــ شیاطین سے مراد جِنّ ہیں۔ اور ''پابندِ سلاسِل شیاطین'' سے مراد وہ خدمت گار شیاطین ہیں جنھیں شرارت کی پاداش میں مُقیَّد کر دیا جاتا تھا۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ بیڑیاں اور زنجیریں جن سے یہ شیاطین باندھے جاتے تھے، لوہے کی ہی بنی ہوئی ہوں اور قیدی انسانوں کی طرح وہ بھی لوگوں کو علانیہ بندھے ہوئے نظر آتے ہوں۔ بہرحال انھیں کسی ایسے طریقے سے مقیّد کیا جاتا تھا جس سے وہ بھاگنے اور شرارت کرنے پر قادر نہ رہتے تھے۔

۳۹ – اس آیت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ یہ ہماری بے حساب بخشش ہے، تمھیں اختیار ہے کہ جسے چاہو دو اور جسے چاہو نہ دو۔ دوسرے، یہ کہ یہ ہماری بخشش ہے، جسے چاہو دو اور جسے چاہو نہ دو، دینے یا نہ دینے پر تم سے کوئی مُحاسَبہ نہ ہوگا۔ ایک اور مطلب بعض مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ شیاطین کُلِّیَّتاً تمھارے تَصَرُّف میں دے دیے گئے ہیں، اِن میں سے جسے چاہو رہا کر دو اور جسے چاہو روک رکھو، اس پر کوئی محاسَبہ تم سے نہ ہوگا۔

۴۰ – اس ذکر سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کی اکڑ جتنی مبغوض ہے، اُس کی عاجزی کی ادا اتنی ہی محبُوب ہے۔ بندہ اگر قصور کرے اور تنبیہ کرنے پر اُلٹا اور زیادہ اکڑ جائے تو انجام وہ ہوتا ہے جو آگے آدم و ابلیس کے قصّے میں بیان ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس ذرا لغزش بھی اگر بندے سے ہو جائے اور وہ توبہ کر کے عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جائے تو اس پر وہ نوازشات فرمائی جاتی ہیں جو داؤد و سلیمان علیہما السلام پر فرمائی گئیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اِستِغفار کے بعد جو دعا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے لفظ بلفظ پورا کیا اور ان کو فی الواقع ایسی بادشاہی دی جو نہ اُن سے پہلے کسی کو ملی تھی، نہ اُن کے بعد آج تک کسی کو عطا کی گئی۔ ہواؤں پر تصرّف اور جِنّوں پر حکمرانی ایک ایسی غیر معمولی طاقت ہے جو انسانی تاریخ میں صرف حضرت سلیمانؑ ہی کو بخشی گئی ہے، کوئی دوسرا اس میں ان کا شریک نہیں ہے۔

QuranUrdu.com

مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴿٤١﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ
بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿٤٢﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى
لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿٤٣﴾ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ

سخت تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔[42] (ہم نے اُسے حکم دیا:) اپنا پاؤں زمین پر مار، یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے۔[43] ہم نے اُسے اس کے اہل و عیال واپس دیے اور ان کے ساتھ اُتنے ہی[44] اور، اپنی طرف سے رحمت کے طور پر، اور عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر۔[45] (اور ہم نے اُس سے کہا:) تنکوں کا ایک مُٹّھا لے اور اُس سے مار دے، اپنی قسم نہ توڑ۔[46]

۴۱ – یہ چوتھا مقام ہے جہاں حضرت ایوبؑ کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نساء، آیت ۱۶۳، سورۂ انعام، آیت ۸۴ اور سورۂ انبیاء، آیات ۸۳ – ۸۴ میں ان کا ذکر گزر چکا ہے اور ہم تفسیر سورۂ انبیاء میں ان کے حالات کی تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷۶ تا ۷۹)

۴۲ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شیطان نے مجھے بیماری میں مبتلا کر دیا ہے اور میرے اُوپر مصائب نازل کر دیے ہیں، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ بیماری کی شدّت، مال و دولت کے ضیاع، اور اَعِزّہ و اقربا کے منہ موڑ لینے سے میں جس تکلیف اور عذاب میں مبتلا ہوں، اُس سے بڑھ کر تکلیف اور عذاب میرے لیے یہ ہے کہ شیطان اپنے وسوسوں سے مجھے تنگ کر رہا ہے، وہ ان حالات میں مجھے اپنے رب سے مایوس کرنے کی کوشش کرتا ہے، مجھے اپنے رب کا ناشکرا بنانا چاہتا ہے، اور اس بات کے درپے ہے کہ میں دامنِ صبر ہاتھ سے چھوڑ بیٹھوں۔ حضرت ایّوبؑ کی فریاد کا یہ مطلب ہمارے نزدیک دو وجوہ سے قابلِ ترجیح ہے: ایک یہ کہ قرآنِ مجید کی رو سے اللہ تعالیٰ نے شیطان کو صرف وسوسہ اندازی ہی کی طاقت عطا فرمائی ہے، یہ اختیارات اس کو نہیں دیے ہیں کہ اللہ کی بندگی کرنے والوں کو بیمار ڈال دے اور انھیں جسمانی اذیتیں دے کر بندگی کی راہ سے ہٹنے پر مجبُور کرے۔ دوسرے یہ کہ سورۂ انبیاء میں جہاں حضرت ایّوبؑ اپنی بیماری کی شکایت اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرتے ہیں، وہاں شیطان کا کوئی ذکر نہیں کرتے بلکہ صرف یہ عرض کرتے ہیں کہ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ”مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔“

۴۳ – یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین پر پاؤں مارتے ہی ایک چشمہ نکل آیا جس کا پانی پینا اور اُس میں غسل کرنا حضرت ایوبؑ کے مَرَض کا علاج تھا۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ کسی سخت جِلدی مرض میں مبتلا تھے۔ بائبل کا بیان بھی یہی ہے کہ سر سے پاؤں تک ان کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔

۴۴ – رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیماری میں حضرت ایوبؑ کی بیوی کے سوا اور سب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا

QuranUrdu.com

تھا، حتّٰی کہ اولاد تک ان سے منہ موڑ گئی تھی۔ اسی چیز کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرما رہا ہے کہ جب ہم نے ان کو شفا عطا فرمائی تو سارا خاندان ان کے پاس پلٹ آیا، اور پھر ہم نے ان کو مزید اولاد عطا کی۔

۴۵ – یعنی اس میں ایک صاحبِ عقل آدمی کے لیے یہ سبق ہے کہ انسان کو نہ اچھے حالات میں خدا کو بھول کر سرکش بننا چاہیے اور نہ بُرے حالات میں اس سے مایوس ہونا چاہیے۔ تقدیر کی بھلائی اور بُرائی سراسر اللہ وحدہٗ لاشریک کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہے تو آدمی کے بہترین حالات کو بدترین حالات میں تبدیل کر دے، اور چاہے تو بُرے سے بُرے حالات سے اس کو بخیریت گزار کر بہترین حالت پر پہنچا دے۔ اس لیے بندۂ عاقل کو ہر حالت میں اسی پر توکّل کرنا چاہیے اور اُسی سے آس لگانی چاہیے۔

۴۶ – اِن الفاظ پر غور کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ایّوبؑ نے بیماری کی حالت میں ناراض ہو کر کسی کو مارنے کی قسم کھالی تھی، (رِوایات یہ ہیں کہ بیوی کو مارنے کی قسم کھائی تھی) اور اس قسم ہی میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تجھے اتنے کوڑے ماروں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطا فرما دی اور حالتِ مرض کا وہ غصہ دور ہو گیا جس میں یہ قسم کھائی گئی تھی، تو اُن کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ قسم پوری کرتا ہوں تو خواہ مخواہ ایک بے گناہ کو مارنا پڑے گا، اور قسم توڑتا ہوں تو یہ بھی ایک گناہ کا اِرتکاب ہے۔ اس مشکل سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس طرح نکالا کہ انھیں حکم دیا، ایک جھاڑو لو جس میں اُتنے ہی تنکے ہوں جتنے کوڑے تم نے مارنے کی قسم کھائی تھی، اور اس جھاڑو سے اُس شخص کو بس ایک ضرب لگا دو، تاکہ تمھاری قسم بھی پوری ہو جائے اور اسے ناروا تکلیف بھی نہ پہنچے۔

بعض فقہا اس رعایت کو حضرت ایوبؑ کے لیے خاص سمجھتے ہیں، اور بعض فقہا کے نزدیک دوسرے لوگ بھی اس رعایت سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ پہلی رائے ابنِ عَساکرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اور ابوبکر جَصّاصؒ نے مُجاہدؒ سے نقل کی ہے، اور امام مالکؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ دوسری رائے کو امام ابوحنیفہ، امام ابویوسُف، امام محمد، امام زُفَر اور امام شافعی رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص، مثلاً اپنے خادم کو دس کوڑے مارنے کی قسم کھا بیٹھا ہو اور بعد میں دسوں کوڑے ملا کر اسے صرف ایک ضرب اس طرح لگا دے کہ ہر کوڑے کا کچھ نہ کچھ حصّہ اس شخص کو ضرور لگ جائے، تو اس کی قسم پوری ہو جائے گی۔

متعدّد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے زانی پر حد جاری کرنے کے معاملے میں بھی اس آیت کا بتایا ہوا طریقہ استعمال فرمایا ہے جو اتنا بیمار یا اتنا ضعیف ہو کہ سو دُرّوں کی مار برداشت نہ کر سکے۔ علّامہ ابوبکر جَصّاصؒ نے حضرت سعید بن سعدؓ بن عُبادہ سے رِوایت نقل کی ہے کہ قبیلۂ بنی ساعِدہ میں ایک شخص سے زِنا کا ارتکاب ہوا اور وہ ایسا مریض تھا کہ بس ہڈی اور چمڑا رہ گیا تھا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ خذوا عثکالًا فیہ مأۃ شمراخ فاضربوہ بھا ضربۃ واحدۃ، ”کھجور کا ایک ٹہنا لو جس میں سو شاخیں ہوں اور اس سے بیک وقت اس شخص کو مار دو۔“ (احکام القرآن) مُسنَدِ احمد، ابوداؤد، نسائی، ابنِ ماجہ، طَبَرانی، عبدالرزاق اور دوسری کُتُبِ حدیث میں بھی اس کی تائید کرنے والی کئی حدیثیں موجود ہیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مریض اور ضعیف پر حد جاری کرنے کے لیے یہی طریقہ مقرر فرمایا تھا۔ البتہ فقہاؒ نے اس کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ ہر شاخ یا ہر تنکا کچھ نہ کچھ مجرم کو لگ جانا چاہیے، اور ایک ہی ضرب سہی، مگر وہ کسی نہ کسی حد تک مجرم کو چوٹ لگانے والی بھی ہونی چاہیے۔ یعنی محض چھو دینا کافی نہیں ہے، بلکہ مارنا ضروری ہے۔

QuranUrdu.com

إِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ إِنَّهٗٓ أَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

ہم نے اُسے صابر پایا، بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف بہت رُجوع کرنے والا۔[۴۷]

یہاں یہ بحث بھی پیدا ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک بات کی قسم کھا بیٹھا ہو اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ نامناسب بات ہے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک رِوایت یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اس صورت میں آدمی کو وہی کام کرنا چاہیے جو بہتر ہو اور یہی اس کا کفّارہ ہے۔ دوسری رِوایت حضورؐ سے یہ ہے کہ اس نامناسب کام کے بجائے آدمی وہ کام کرے جو اچھا ہو اور اپنی قَسم کا کفّارہ ادا کردے۔ یہ آیت اسی دوسری روایت کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ ایک نامناسب کام نہ کرنا ہی اگر قسم کا کفارہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضرت ایوبؑ سے یہ نہ فرماتا کہ تم ایک جھاڑو مار کر اپنی قَسم پوری کرلو، بلکہ یہ فرماتا کہ تم یہ نامناسب کام نہ کرو اور اسے نہ کرنا ہی تمھاری قسم کا کفّارہ ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النور، حاشیہ ۲۰)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی نے جس بات کی قَسم کھائی ہو اُسے فوراً پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ حضرت ایوبؑ نے قَسم بیماری کی حالت میں کھائی تھی اور اسے پورا تندرست ہونے کے بعد کیا، اور تندرست ہونے کے بعد بھی فوراً ہی نہیں کر دیا۔

بعض لوگوں نے اس آیت کو حیلۂ شرعی کے لیے دلیل قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک حیلہ ہی تھا جو حضرت ایوبؑ کو بتایا گیا تھا، لیکن وہ کسی فرض سے بچنے کے لیے نہیں بلکہ ایک بُرائی سے بچنے کے لیے بتایا گیا تھا۔ لہٰذا شریعت میں صرف وہی حیلے جائز ہیں جو آدمی کو اپنی ذات سے یا کسی دوسرے شخص سے ظلم اور گناہ اور بُرائی کو دفع کرنے کے لیے اختیار کیے جائیں۔ ورنہ حرام کو حلال کرنے یا فرائض کو ساقط کرنے یا نیکی سے بچنے کے لیے حیلہ سازی گناہ دَر گناہ ہے۔ بلکہ اس کے ڈانڈے کفر سے جا ملتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص اِن ناپاک اغراض کے لیے حیلہ کرتا ہے وہ گویا خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ مثلاً جو شخص زکوٰۃ سے بچنے کے لیے سال ختم ہونے سے پہلے اپنا مال کسی اور کی طرف منتقل کر دیتا ہے وہ محض ایک فرض ہی سے فرار نہیں کرتا، وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اس ظاہری فعل سے دھوکا کھا جائے گا اور اسے فرض سے سبکدوش سمجھ لے گا۔ جن فقہا نے اس طرح کے حیلے اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احکامِ شریعت سے جان چھڑانے کے لیے یہ حیلہ بازیاں کرنی چاہییں۔ بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گناہ کو قانونی شکل دے کر بچ نکلے تو قاضی یا حاکم اس پر گرفت نہیں کرسکتا، اُس کا معاملہ خدا کے حوالے ہے۔

۴۷ – حضرت ایوبؑ کا ذکر اس سیاق وسباق میں یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کے نیک بندے جب مصائب وشدائد میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے رب سے شِکوہ سنج نہیں ہوتے بلکہ صبر کے ساتھ اس کی ڈالی ہوئی آزمایشوں کو برداشت کرتے ہیں اور اُسی سے مدد مانگتے ہیں۔ ان کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ اگر کچھ مدت تک خدا سے دعا مانگتے رہنے پر بلا نہ ٹلے تو پھر اس سے مایوس ہو کر دوسروں کے آستانوں پر ہاتھ پھیلانا شروع کر دیں۔ بلکہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ملنا ہے اللہ ہی کے ہاں سے ملنا ہے، اس لیے مصیبتوں کا سلسلہ چاہے کتنا ہی دراز ہو، وہ اُسی کی رحمت کے امیدوار بنے رہتے ہیں۔ اسی لیے وہ اُن الطاف وعنایات سے سرفراز ہوتے ہیں جن کی مثال حضرت ایوبؑ کی زندگی میں ملتی ہے۔ حتّٰی کہ اگر وہ کبھی مضطرب ہو کر کسی اَخلاقی مخمصے میں

QuranUrdu.com

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾
اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ
الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۷﴾ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ وَكُلٌّ

اور ہمارے بندوں، ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا ذکر کرو۔ بڑی قوّتِ عمل رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ تھے[۴۸]۔ ہم نے اُن کو ایک خالص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا، اور وہ دارِ آخرت کی یاد تھی[۴۹]۔ یقیناً ہمارے ہاں ان کا شمار چُنے ہوئے نیک اشخاص میں ہے۔ اور اسماعیلؑ اور اَلیَسَعؑ[۵۰] اور ذُوالکِفلؑ[۵۱] کا ذکر کرو، یہ سب

پھنس بھی جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں بُرائی سے بچانے کے لیے ایک راہ نکال دیتا ہے جس طرح اس نے حضرت ایوبؑ کے لیے نکال دی۔

۴۸ – اصل الفاظ ہیں: اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ (ہاتھوں والے اور نگاہوں والے۔) ہاتھ سے مراد، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں، قوت وقدرت ہے۔ اور اِن انبیا کو صاحبِ قوت وقدرت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نہایت باعمل لوگ تھے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے اور معصیتوں سے بچنے کی زبردست طاقت رکھتے تھے، اور دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے انھوں نے بڑی کوششیں کی تھیں۔ نگاہ سے مراد آنکھوں کی بینائی نہیں بلکہ دل کی بصیرت ہے۔ وہ حق بیں اور حقیقت شناس لوگ تھے۔ دنیا میں اندھوں کی طرح نہیں چلتے تھے بلکہ آنکھیں کھول کر علم ومعرفت کی پوری روشنی میں ہدایت کا سیدھا راستہ دیکھتے ہوئے چلتے تھے۔ ان الفاظ میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جو لوگ بدعمل اور گمراہ ہیں وہ درحقیقت ہاتھوں اور آنکھوں، دونوں سے محروم ہیں۔ ہاتھ والا حقیقت میں وہی ہے جو اللہ کی راہ میں کام کرے، اور آنکھوں والا دراصل وہی ہے جو حق کی روشنی اور باطل کی تاریکی میں امتیاز کرے۔

۴۹ – یعنی ان کی تمام سرفرازیوں کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُن کے اندر دنیا طلبی اور دنیا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا، ان کی ساری فکر وسعی آخرت کے لیے تھی، وہ خود بھی اُس کو یاد رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اُس کی یاد دلاتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مرتبے دیے جو دنیا بنانے کی فکر میں منہمک رہنے والے لوگوں کو کبھی نصیب نہ ہوئے۔ اس سلسلے میں یہ لطیف نکتہ بھی نگاہ میں رہنا چاہیے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے آخرت کے لیے صرف الدَّار (وہ گھر، یا اصل گھر) کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس سے یہ حقیقت ذہن نشین کرنی مطلوب ہے کہ یہ دنیا سرے سے انسان کا گھر ہے ہی نہیں، بلکہ یہ صرف ایک گزر گاہ ہے، ایک مسافر خانہ ہے جس سے آدمی کو بہرحال رخصت ہو جانا ہے۔ اصل گھر وہی آخرت کا گھر ہے۔ جو شخص اس کو سنوارنے کی فکر کرتا ہے وہی صاحبِ بصیرت ہے اور اللہ کے نزدیک لامحالہ اسی کو پسندیدہ انسان ہونا چاہیے۔ رہا وہ شخص جو اس مسافر خانے میں اپنی چند روزہ قیام گاہ کو سجانے کے لیے وہ حرکتیں کرتا ہے جن سے آخرت کا اصل گھر اُس کے لیے اُجڑ جائے، وہ عقل کا اندھا

QuranUrdu.com

مِّنَ الْاَخْيَارِؕ ﴿۴۸﴾ هٰذَا ذِكْرٌؕ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍۙ ﴿۴۹﴾ جَنّٰتِ
عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُۚ ﴿۵۰﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ

نیک لوگوں میں سے تھے۔

یہ ایک ذکر تھا۔(اب سُنو کہ) متّقی لوگوں کے لیے یقیناً بہترین ٹھکانا ہے، ہمیشہ رہنے والی جنّتیں جن کے دروازے اُن کے لیے کُھلے ہوں [52] گے۔ ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، خوب خوب فواکہ اور

ہے اور فطری بات ہے کہ ایسا آدمی اللہ کو پسند نہیں آ سکتا۔

۵۰ — قرآنِ مجید میں ان کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے: ایک سورۂ انعام، آیت ۸۶ میں۔ دوسرے اِس جگہ۔ اور دونوں مَقامات پر کوئی تفصیل نہیں ہے بلکہ صرف انبیائے کرامؑ کے سلسلے میں ان کا نام لیا گیا ہے۔ وہ بنی اسرائیل کے اکابر انبیاءؑ میں سے تھے۔ دریائے اُرْدُن کے کنارے ایک مَقام ابیل مَحُولہ (Abel Meholah) کے رہنے والے تھے۔ یہودی اور عیسائی ان کو اِلِیشَعؑ (Elisha) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام جس زمانے میں جزیرہ نمائے سینا میں پناہ گزیں تھے، اُن کو چند اہم کاموں کے لیے شام و فلسطین کی طرف واپس جانے کا حکم دیا گیا، جن میں سے ایک کام یہ تھا کہ حضرت اَلْیَسَعؑ کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کریں۔ اِس فرمان کے مطابق جب حضرت الیاسؑ اِن کی بستی پر پہنچے تو دیکھا کہ یہ بارہ جوڑی بیل آگے لیے زمین جوت رہے ہیں اور خود بارھویں جوڑی کے ساتھ ہیں۔ انھوں نے اِن کے پاس سے گزرتے ہوئے اِن پر اپنی چادر ڈال دی اور یہ کھیتی باڑی چھوڑ کر ساتھ ہو لیے۔ (۱-سلاطین، باب ۱۹، فقرات ۱۵ تا ۲۱) تقریباً دس بارہ سال یہ اُن کے زیرِ تربیت رہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اُٹھا لیا تو یہ اُن کی جگہ مقرر ہوئے۔ (۲-سلاطین، باب ۲) بائبل کی کتاب ۲-سلاطین میں باب ۲ سے ۱۳ تک ان کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ درج ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی فلسطین کی اسرائیلی سلطنت جب شرک و بُت پرستی اور اَخلاقی نجاستوں میں غرق ہوتی ہی چلی گئی تو آخر کار انھوں نے یاہُو بن یہُوسفط بن نِمسی کو اُس خانوادۂ شاہی کے خلاف کھڑا کیا جس کے کرتوتوں سے اسرائیل میں یہ بُرائیاں پھیلی تھیں، اور اس نے نہ صرف بَعل پرستی کا خاتمہ کیا، بلکہ اس بدکردار خاندان کے بچّے بچّے کو قتل کر دیا۔ لیکن اس اصلاحی انقلاب سے بھی وہ برائیاں پوری طرح نہ مٹ سکیں جو اسرائیل کی رگ رگ میں اُتر چکی تھیں، اور حضرت اَلْیَسَعؑ کی وفات کے بعد تو انھوں نے طوفانی شکل اختیار کر لی، یہاں تک کہ سامریہ پر اَشُّوریوں کے پے در پے حملے شروع ہو گئے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن جلد ۲، بنی اسرائیل، حاشیہ ۷ اور تفسیر سورۂ صافّات، حاشیہ ۷۰، ۷۱)

۵۱ — حضرت ذوالکِفلؑ کا ذکر بھی قرآنِ مجید میں دو ہی جگہ آیا ہے۔ ایک سورۂ انبیاء۔ دوسرے یہ مقام۔ ان کے متعلق ہم اپنی تحقیق سورۂ انبیاء میں بیان کر چکے ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۱)

۵۲ — اصل الفاظ ہیں: مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ۔ اس کے کئی معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ ایک، یہ کہ ان جنتوں میں وہ بے روک ٹوک پھریں گے کہیں ان کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ دوسرے، یہ کہ جنت کے دروازے کھولنے کے لیے کسی کوشش کی حاجت

QuranUrdu.com

كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿۵۱﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿۵۲﴾ هٰذَا مَا
تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾ هٰذَا ۭ وَ الثلثة
اِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾ هٰذَا ۙ
فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ﴿۵۸﴾ هٰذَا فَوْجٌ
مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ۭ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۣ
لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ۭ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ

مشروبات طلب کر رہے ہوں گے اور ان کے پاس شرمیلی ہم سِن بیویاں ہوں گی[۵۳]۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں حساب کے دِن عطا کرنے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

یہ تو ہے مُتّقیوں کا انجام۔ اور سرکشوں کے لیے بد ترین ٹھکانا ہے، جہنّم جس میں وہ جُھلسے جائیں گے بہت ہی بُری قیام گاہ۔ یہ ہے اُن کے لیے، پس وہ مزا چکھیں کھَولتے ہوئے پانی اور پِیپ لہُو[۵۴] اور اسی قسم کی دوسری تلخیوں کا۔ (وہ جہنّم کی طرف اپنے پیروؤں کو آتے دیکھ کر آپس میں کہیں گے:) "یہ ایک لشکر تمھارے پاس گھُسا چلا آ رہا ہے، کوئی خوش آمدید اِن کے لیے نہیں ہے، یہ آگ میں جُھلسنے والے ہیں"۔ وہ اُن کو جواب دیں گے: "نہیں بلکہ تم ہی جُھلسے جا رہے ہو کوئی خیر مقدم تمھارے لیے نہیں۔ تم ہی تو یہ انجام ہمارے آگے لائے ہو، کیسی بُری ہے یہ جائے قرار"۔ پھر وہ کہیں گے: "اے ہمارے رب! جس نے

نہ ہو گی بلکہ وہ مجرّد ان کی خواہش پر خود بخود کُھل جائیں گے۔ تیسرے، یہ کہ جنت کے انتظام پر جو فرشتے مقرر ہوں گے وہ اہلِ جنت کو دیکھتے ہی ان کے لیے دروازے کھول دیں گے۔ یہ تیسرا مضمون قرآنِ مجید میں ایک اور مقام پر زیادہ صاف الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ۔ "یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے تو جنت کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ سلامٌ علیکم! خوش آمدید! ہمیشہ کے لیے اس میں داخل ہو جائیے۔" (الزُّمَر: ۷۳)

۵۳ – ہم سِن بیویوں کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں ہم سِن ہوں گی اور یہ بھی کہ وہ اپنے شوہروں کی

QuranUrdu.com

قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿٦١﴾ وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرٰى
رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْأَشْرَارِ ﴿٦٢﴾ أَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ
الْأَبْصَارُ ﴿٦٣﴾ إِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾ قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنْذِرٌ
وَّمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٦٥﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ﴿٦٦﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيمٌ ﴿٦٧﴾ أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ﴿٦٨﴾

ع ۴ ۱۳

ہمیں اس انجام کو پہنچانے کا بندوبست کیا اُس کو دوزخ کا دُہرا عذاب دے۔“ اور وہ آپس میں کہیں گے: ”کیا بات ہے، ہم اُن لوگوں کو کہیں نہیں دیکھتے جنھیں ہم دنیا میں بُرا سمجھتے تھے؟[55] ہم نے یونہی ان کا مذاق بنالیا تھا، یا وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہیں؟“ بے شک یہ بات سچّی ہے، اہلِ دوزخ میں یہی کچھ جھگڑے ہونے والے ہیں۔ ع

(اے نبیؐ!) اِن سے کہو:[56] ”میں تو بس خبردار کردینے والا ہوں۔[57] کوئی حقیقی معبود نہیں مگر اللہ، جو یکتا ہے، سب پر غالب، آسمانوں اور زمین کا مالک اور اُن ساری چیزوں کا مالک جو اُن کے درمیان ہیں، زبردست اور درگزر کرنے والا۔“ اِن سے کہو: ”یہ ایک بڑی خبر ہے جس کو سُن کر تم منہ پھیرتے ہو۔[58]“

ہم سِن ہوں گی۔

۵۴ – اصل میں لفظ غَسَّاقٌ استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی اہلِ لغت نے بیان کیے ہیں۔ ایک معنی جسم سے نکلنے والی رطوبت کے ہیں جو پیپ، لہو، کچ لہو وغیرہ کی شکل میں ہو، اور اس میں آنسو بھی شامل ہیں۔ دوسرے معنی انتہائی سرد چیز کے ہیں۔ اور تیسرے معنی انتہائی بدبودار مُتعفّن چیز کے۔ لیکن اس لفظ کا عام استعمال پہلے ہی معنی میں ہوتا ہے، اگرچہ باقی دونوں معنی بھی لغت کے اعتبار سے دُرست ہیں۔

۵۵ – مراد ہیں وہ اہلِ ایمان جن کو یہ کفار دنیا میں بُرا سمجھتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ حیران ہو ہو کر ہر طرف دیکھیں گے کہ اس جہنّم میں ہم اور ہمارے پیشوا تو موجود ہیں مگر اُن لوگوں کا یہاں کہیں پتا نشان تک نہیں ہے جن کی ہم دنیا میں بُرائیاں کرتے تھے اور خدا، رسول، آخرت کی باتیں کرنے پر جن کا مذاق ہماری مجلسوں میں اُڑایا جاتا تھا۔

۵۶ – اب کلام کا رُخ پھر اُسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جس سے تقریر کا آغاز ہوا تھا۔ اِس حصّے کو پڑھتے ہوئے پہلے رُکوع سے مقابلہ کرتے جائیے، تاکہ بات پوری طرح سمجھ میں آسکے۔

QuranUrdu.com

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۶۹﴾ اِنْ يُّوْحٰۤى اِلَيَّ
اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۰﴾ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ
بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿۷۱﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ

(ان سے کہو:) "مجھے اُس وقت کی کوئی خبر نہ تھی جب مَلاءِ اعلیٰ میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ مجھ کو تو وحی کے ذریعے سے یہ باتیں صرف اس لیے بتائی جاتی ہیں کہ میں کُھلا کُھلا خبردار کرنے والا ہوں۔" جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا:[59] "مَیں مٹّی سے ایک بشر بنانے والا ہوں[60]، پھر جب مَیں اسے پُوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی رُوح پھُونک دوں[61]

۵۷ – آیت نمبر ۴ میں فرمایا گیا تھا کہ یہ لوگ اس بات پر بڑے اَچنبھے کا اظہار کر رہے ہیں کہ ایک خبردار کرنے والا خود ان کے درمیان سے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ان سے کہو میرا کام بس تمھیں خبردار کر دینا ہے۔ یعنی میں کوئی فوجدار نہیں ہوں کہ زبردستی تمھیں غلط راستے سے ہٹا کر سیدھے راستے کی طرف کھینچوں۔ میرے سمجھانے سے اگر تم نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ بے خبر ہی رہنا اگر تمھیں پسند ہے تو اپنی غفلت میں سرشار پڑے رہو، اپنا انجام خود دیکھ لو گے۔

۵۸ – یہ جواب ہے کفار کی اُس بات کا جو آیت نمبر ۵ میں گزری ہے کہ "کیا اِس شخص نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ تم چاہے کتنی ہی ناک بھوں چڑھاؤ، مگر یہ ہے ایک حقیقت جس کی خبر میں تمھیں دے رہا ہوں، اور تمھارے ناک بھوں چڑھانے سے یہ حقیقت بدل نہیں سکتی۔

اس جواب میں صرف بیانِ حقیقت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے حقیقت ہونے کی دلیل بھی اسی میں موجود ہے۔ مشرکین کہتے تھے کہ معبُود بہت سے ہیں جن میں سے ایک اللہ بھی ہے، تم نے سارے معبُودوں کو ختم کر کے بس ایک معبُود کیسے بنا ڈالا؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ معبُودِ حقیقی صرف ایک اللہ ہی ہے، کیونکہ وہ سب پر غالب ہے، زمین و آسمان کا مالک ہے، اور کائنات کی ہر چیز اس کی مِلک ہے۔ اُس کے ماسوا اس کائنات میں جن ہستیوں کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں سے کوئی ہستی بھی ایسی نہیں ہے جو اُس سے مغلوب اور اس کی مملوک نہ ہو۔ یہ مغلوب اور مملوک ہستیاں اُس غالب اور مالک کے ساتھ خدائی میں شریک کیسے ہو سکتی ہیں اور آخر کس حق کی بنا پر انھیں معبُود قرار دیا جا سکتا ہے۔

۵۹ – یہ اُس جھگڑے کی تفصیل ہے جس کی طرف اُوپر کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور جھگڑے سے مراد شیطان کا خدا سے جھگڑا ہے جیسا کہ آگے کے بیان سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ "مَلاءِ اعلیٰ" سے مراد فرشتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے شیطان کا مکالمہ دُوبدُو نہیں بلکہ کسی فرشتے ہی کے توسُّط سے ہوا ہے۔ اس لیے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بھی مَلاءِ اعلیٰ میں شامل تھا۔ جو قصہ یہاں بیان کیا جا رہا ہے وہ اس سے پہلے حسبِ ذیل مقامات پر گزر چکا ہے: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۳۵ تا ۵۳۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۱۰ تا ۱۵، الحِجر، حواشی ۱۷ تا ۱۹، بنی اسرائیل، حواشی ۷۱ تا ۸۲۔ جلد سوم، الکہف، حواشی ۴۶ تا ۴۸، طٰہٰ، حواشی ۹۲ تا ۱۰۶۔

QuranUrdu.com

فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّآ
اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ
اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾
قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ

تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔[۶۲] اس حکم کے مطابق فرشتے سب کے سب سجدے میں گر گئے، مگر ابلیس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔[۶۳] رب نے فرمایا: "اے ابلیس! تجھے کیا چیز اُس کو سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟[۶۴] تُو بڑا بن رہا ہے یا تُو ہے ہی کچھ اُونچے درجے کی ہستیوں میں سے؟" اُس نے جواب دیا: "میں اُس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اِس کو مٹی سے۔" فرمایا:

۶۰ - بَشَر کے لغوی معنیٰ ہیں جسمِ کثیف جس کی ظاہری سطح کسی دوسری چیز سے ڈھکی ہوئی نہ ہو۔ انسان کی تخلیق کے بعد تو یہ لفظ انسان ہی کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ لیکن تخلیق سے پہلے اس کا ذکر لفظِ بشر سے کرنے اور اس کو مٹی سے بنانے کا صاف مطلب یہ ہے کہ "میں مٹی کا ایک پُتلا بنانے والا ہوں جو بال و پَر سے عاری ہوگا، یعنی جس کی جِلد دوسرے حیوانات کی طرح اُون یا صُوف یا بالوں اور پَروں سے ڈھکی ہوئی نہ ہوگی۔"

۶۱ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحجر، حواشی ۱۷ تا ۱۹۔ جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۱۶۔

۶۲ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۴۵۔ جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۰۔

۶۳ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۴۷، الکہف، حاشیہ ۴۸۔

۶۴ - یہ الفاظ تخلیقِ انسانی کے شَرَف پر دلالت کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ بادشاہ کا اپنے خدّام سے کوئی کام کرانا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ وہ ایک معمولی کام تھا جو خدّام سے کرا لیا گیا۔ بخلاف اس کے بادشاہ کا کسی کام کو بنفسِ نفیس انجام دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک افضل و اشرف کام تھا۔ پس اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جسے میں نے خود بلا واسطہ بنایا ہے، اُس کے آگے جُھکنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟

"دونوں ہاتھوں" کے لفظ سے غالباً اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس نئی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی شانِ تخلیق کے دو اہم پہلو پائے جاتے ہیں: ایک، یہ کہ اسے جسمِ حیوانی عطا کیا گیا جس کی بنا پر وہ حیوانات کی جنس میں سے ایک نوع ہے۔ دوسرے، یہ کہ اس کے اندر وہ رُوح ڈال دی گئی جس کی بنا پر وہ اپنی صفات میں تمام ارضی مخلوقات سے اشرف و افضل ہو گیا۔

QuranUrdu.com

فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۷۷﴾ وَّ اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ
الدِّيْنِ ﴿۷۸﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۷۹﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ
الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۸۱﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۸۳﴾ قَالَ فَالْحَقُّ ۖ وَالْحَقَّ
اَقُوْلُ ﴿۸۴﴾ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۵﴾

”اچھا تو یہاں سے نِکل جا[۶۵]، تو مردُود ہے[۶۶] اور تیرے اُوپر یوم الجزا تک میری لعنت ہے[۶۷]۔“ وہ بولا: ”اے میرے رب! یہ بات ہے تو پھر مجھے اُس وقت تک کے لیے مُہلت دے دے جب یہ لوگ دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔“ فرمایا: ”اچھا، تجھے اُس روز تک کی مُہلت ہے جس کا وقت مجھے معلوم ہے۔“ اس نے کہا: ”تیری عزّت کی قسم! میں اِن سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا، بجز تیرے اُن بندوں کے جنھیں تو نے خالص کرلیا ہے[۶۸]۔“ فرمایا: ”تو حق یہ ہے، اور مَیں حق ہی کہا کرتا ہوں، کہ میں جہنّم کو تجھ سے[۶۹] اور اُن سب لوگوں سے بھر دُوں گا جو اِن انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے[۷۰]۔“

۶۵ – یعنی اس مقام سے جہاں آدمؑ کی تخلیق ہوئی اور جہاں آدمؑ کے آگے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا اور جہاں ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا اِرتکاب کیا۔

۶۶ – اصل میں لفظ ”رَجِيْم“ استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنیٰ ہیں: ”پھینکا ہوا“ یا ”مارا ہوا“۔ اور محاورے میں یہ لفظ اُس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے مقامِ عزت سے گرا دیا گیا ہو اور ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ سورۂ اَعراف میں یہی مضمون اِن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے: فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ”پس تو نکل جا، تو ذلیل ہستیوں میں سے ہے۔“

۶۷ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یوم الجزا کے بعد اُس پر لعنت نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوم الجزا تک تو وہ اس نافرمانی کی پاداش میں مبتلائے لعنت رہے گا، اور یوم الجزا کے بعد وہ اپنے اُن کرتوتوں کی سزا بھگتے گا جو تخلیقِ آدمؑ کے وقت سے لے کر قیامت تک اس سے سرزد ہوں گے۔

۶۸ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ”میں تیرے چیدہ بندوں کو بہکاؤں گا نہیں“، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ”تیرے چیدہ بندوں پر میرا بس نہ چلے گا۔“

۶۹ – ”تجھ سے“ کا خطاب صرف شخص ابلیس ہی کی طرف نہیں ہے بلکہ پوری جنسِ شیاطین کی طرف ہے، یعنی

QuranUrdu.com

قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَکَلِّفِیۡنَ ﴿۸۶﴾ اِنۡ
ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۷﴾ وَ لَتَعۡلَمُنَّ نَبَاَہٗ بَعۡدَ حِیۡنٍ ﴿۸۸﴾ ع

ع ۵ ۲۴ ۱۴

(اے نبیؐ!) اِن سے کہہ دو کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا،[۷۱] اور نہ میں بناوٹی لوگوں میں سے ہوں۔[۷۲] یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے۔ اور تھوڑی مدّت ہی گزرے گی کہ تمھیں اس کا حال خود معلوم ہو جائے گا۔[۷۳] ع

ابلیس اور اس کا وہ پورا گروہِ شیاطین جو اُس کے ساتھ مل کر نوعِ انسانی کو گمراہ کرنے میں لگا رہے گا۔

۷۰ – یہ پورا قصہ سردارانِ قریش کے اس قول کے جواب میں سنایا گیا ہے کہ ءَاُنۡزِلَ عَلَیۡہِ الذِّکۡرُ مِنۡۢ بَیۡنِنَا، ''کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر ذکر نازل کیا گیا؟'' اس کا ایک جواب تو وہ تھا جو آیات نمبر ۹ اور ۱۰ میں دیا گیا تھا کہ کیا خدا کی رحمت کے خزانوں کے تم مالک ہو، اور کیا آسمان و زمین کی بادشاہی تمھاری ہے اور یہ فیصلہ کرنا تمھارا کام ہے کہ خدا کا نبی کسے بنایا جائے اور کسے نہ بنایا جائے؟ دوسرا جواب یہ ہے، اور اس میں سردارانِ قریش کو بتایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں تمھارا حسد اور اپنی بڑائی کا گھمنڈ، آدم علیہ السلام کے مقابلے میں ابلیس کے حسد اور گھمنڈ سے ملتا جلتا ہے۔ ابلیس نے بھی اللہ تعالیٰ کے اس حق کو ماننے سے انکار کیا تھا کہ جسے وہ چاہے اپنا خلیفہ بنائے، اور تم بھی اُس کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہو کہ جسے وہ چاہے اپنا رسول بنائے۔ اُس نے آدمؑ کے آگے جھکنے کا حکم نہ مانا اور تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا حکم نہیں مان رہے ہو۔ اس کے ساتھ تمھاری یہ مُشابہت بس اس حد پر ختم نہ ہو جائے گی، بلکہ تمھارا انجام بھی پھر وہی ہوگا جو اُس کے لیے مقدر ہو چکا ہے، یعنی دنیا میں خدا کی لعنت، اور آخرت میں جہنم کی آگ۔

اس کے ساتھ اس قصّے کے ضمن میں دو باتیں اور بھی سمجھائی گئی ہیں۔ ایک، یہ کہ جو انسان بھی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے وہ دراصل اپنے اُس اَزلی دشمن، ابلیس کے پھندے میں پھنس رہا ہے جس نے آغازِ آفرینش سے نوعِ انسانی کو اِغوا کرنے کا تہیّہ کر رکھا ہے۔ دوسرے، یہ کہ وہ بندہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں انتہائی مبغوض ہے جو تکبر کی بنا پر اس کی نافرمانی کرے اور پھر اپنی اس نافرمانی کی رَوش پر اِصرار کیے چلا جائے۔ ایسے بندے کے لیے اللہ کے ہاں کوئی معافی نہیں ہے۔

۷۱ – یعنی میں ایک بے غرض آدمی ہوں، اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے یہ تبلیغ نہیں کر رہا ہوں۔

۷۲ – یعنی میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے جھوٹے دعوے لے کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ کچھ بن بیٹھتے ہیں جو فی الواقع وہ نہیں ہوتے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے محض کفارِ مکہ کی اِطّلاع کے لیے نہیں کہلوائی گئی ہے، بلکہ اس کے پیچھے حضورؐ کی وہ پوری زندگی شہادت کے طور پر موجود ہے جو نبوت سے پہلے انھی کفار کے درمیان چالیس برس تک گزر چکی تھی۔ مکّے کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بناوٹی آدمی نہیں ہیں۔ پوری قوم

QuranUrdu.com

میں کسی شخص نے بھی کبھی اُن کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ سنی تھی جس سے یہ شبہ کرنے کی گنجایش ہوتی کہ وہ کچھ بننا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

۷۳ - یعنی جو تم میں سے زندہ رہیں گے وہ چند سال کے اندر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ پوری ہو کر رہی۔ اور جو مر جائیں گے ان کو موت کے دروازے سے گزرتے ہی پتا چل جائے گا کہ حقیقت وہی کچھ ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔